در دفاع حضرت نفیس شاہ صاحب

حافظ ظفر اللہ شفیق صاحب کی کتابوں

امام حسین اور واقعہ کربلا' اور اقرار مودت

میں مذکور غلطیوں کے بارے میں تنقید و تحقیق بنام

# جوابِ نفیس


ڈاکٹر مفتی عبد الواحد

دار الافتاء۔ جامعہ مدنیہ لاہور



دار الافتاء والتحقیق

جامع مسجد الہلال، چوبرجی پارک لاہور

# پیش لفظ

بسم اللہ حامدا و مصلیا

حافظ ظفر اللہ شفیق صاحب سے ہماری پرانی شناسائی ہے۔ چند دن پہلے اتفاق سے ان کی کتاب ''امام حسین ؓ اور واقعہ کربلا'' نظر سے گزری۔ اس پر حضرت نفیس شاہ صاحب رحمہ اللہ سمیت بعض بڑے لوگوں کی تقریظات ہیں۔ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ نے اپنی زندگی کے آخری کئی سال حضرات اہل بیت کے دفاع میں اور ان کے مناقب پھیلانے میں گویا وقف کئے ہوئے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ حافظ ظفر اللہ صاحب نے اس پہلو سے بھی اپنی کتاب میں بہت کچھ لکھا ہے جو قابل قدر ہے لیکن حضرت حسین ؓ اور واقعہ کربلا کے حوالہ سے وہ جادہ حق پر ثابت قدم نہ رہ سکے اور کچھ قابل اعتراض ایسی باتیں لکھ گئے جن کی ان سے قطعاً توقع نہ تھی۔

الحمدللہ ہم اہلسنت کے عقیدے کے مطابق یزید کو فاسق سمجھتے ہیں اور حضرت حسین ؓ کے اقدام کو جہاد سمجھتے ہیں بغاوت نہیں اور حضرات حسنین رضی اللہ عنہما سمیت تمام اہل بیت کے مناقب کے قائل ہیں۔ ہمیں

خیال ہوا کہ جناب حافظ صاحب کی غلطیوں کو واضح کر دیں۔ یہ وہ غلطیاں ہیں کہ اگر حضرت نفیس شاہ صاحب رحمہ اللہ اور حضرت مولانا عبدالمجید صاحب مدظلہ (باب العلوم کہروڑ پکا) کی توجہ ان کی طرف دلائی جاتی تو وہ کتاب میں سے ان کے اخراج کا حکم ضرور دیتے۔

ہم جناب حافظ ظفر اللہ صاحب سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ کتاب پر نظر ثانی کریں گے اور کتاب کے اگلے ایڈیشن میں ان سے اور ایسی تمام باتوں سے اجتناب کریں گے۔

یہ چند باتیں ہم نے ایک غیر رسمی تحریر کے ذریعہ جناب حافظ صاحب کو حضرت نفیس شاہ صاحب رحمہ اللہ کے خادم بھائی رضوان صاحب کے ہاتھ بھجوائی اور ہم ابھی ان کی جانب سے غیر رسمی جواب کے انتظار میں تھے کہ اتنے میں ہمیں خلاف توقع باقاعدہ چھپے ہوئے کتابچے کی صورت میں ''اقرار مودت'' کے نام سے حافظ صاحب کا جواب ملا۔ ہمیں حیرت ہوئی کہ جب ہم نے ابھی اپنے اعتراض شائع ہی نہیں کیے تو جواب چھاپنے کی کیا ضرورت تھی؟ ہمارے اس پیش لفظ پر حافظ صاحب نے جو اعتراض کیے ان میں سے ہم دو کا جواب دیتے ہیں۔ حافظ صاحب نے لکھا:

1- مجھ تک یہ اعتراض نامہ پہنچنے سے پہلے ڈاکٹر صاحب کی اس سرگرمی کی خبر پھیلائی گئی مجھے اعتراض نامہ کی چھٹی کاپی موصول ہوئی۔ اس سے پہلے پانچ کاپیاں تقسیم ہو چکی تھیں، بعد میں بھی متعدد نقول لوگوں میں بانٹی گئیں۔'' (اقرار مودت ص 2)

2- ''کتاب مذکور (یعنی امام حسینؓ اور واقعہ کربلا) شاہ صاحبؒ کی زندگی میں دو مرتبہ چھپی، تین مرتبہ انہوں نے سنی اور دعاؤں سے مالا مال کر دیا، تقریظ بھی لکھ دی''۔ (اقرار مودت ص 2)

حافظ صاحب کی پہلی بات کا جواب یہ ہے کہ جن حضرات نے ان کی کتاب پر تقریظیں لکھیں ہم نے اپنی اس تحریر کی کاپی ان میں سے صرف چار حضرات کو بھیجی تھی یعنی (1) حضرت

مولانا عبدالمجید صاحب مدظلہ شیخ الحدیث باب العلوم کہروڑ پکا۔ (2) حضرت ڈاکٹر عبدالمقیم صاحب مدظلہ۔ (3) حضرت مولانا محمد انور اوکاڑوی صاحب مدظلہ۔ (4) مولانا طارق جمیل صاحب مدظلہ، اور ایک کاپی حضرت نفیس شاہ صاحب رحمہ اللہ کے خادم بھائی رضوان صاحب کو بھیجی تھی۔ ان حضرات کے نام ہم نے اپنی تحریر کے پہلے صفحہ پر لکھ بھی دیئے تھے تا کہ حافظ صاحب کو علم ہو کہ ان حضرات کو بھی تحریر بھیجی گئی ہے۔

ان انتہائی محدود حضرات کی خدمت میں یہ تحریر بھیجنے سے غرض یہ تھی کہ مصنف اور تقریظ لکھنے والے اپنی بات پر نظر ثانی کر لیں۔ حافظ صاحب نے اقرار مودت چھاپنے کی یہ وجہ لکھی کہ ''ڈاکٹر صاحب کی اس تحریر کو منفی انداز میں پھیلایا گیا'' اس کا ہمیں کچھ علم نہیں۔ حافظ صاحب کا کتابچہ موصول ہونے پر ہم نے ان سے براہ راست رابطہ کیا اور ان سے بالمشافہ کچھ نکات پر گفتگو کی لیکن بات نہ بنی۔ اب ہم اصل تحریر کو بڑے خط میں من وعن شائع کر رہے ہیں۔ اور ''اقرار مودت'' میں مندرج باتوں کا جواب چھوٹے خط میں دے رہے ہیں۔ یہ تسلی رہے کہ عبارت میں تسلسل ہے۔ اس لیے پڑھنے والے کو کچھ پریشانی نہ ہوگی۔

حافظ صاحب کی دوسری بات کے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ اس کام سے ہماری غرض یہ ہے کہ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ جنہوں نے ہمیں حضرت سید احمد شہید رحمہ اللہ کے سلسلہ میں اجازت بھی دی تھی، ان کے نام سے کسی غلط بات کو سند جواز نہ مل جائے۔ ہمیں ان کی لکھی ہوئی تقریظ سے انکار نہیں لیکن ہمیں بھی الحمد للہ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کی ایک طویل عرصہ تک صحبت حاصل رہی ہے اس لیے ہمیں اپنے اندازے پر پورا اطمینان ہے کہ حضرت شاہ صاحب کے سامنے اگر قابل اعتراض باتوں کی نشاندہی کی جاتی تو آپ ان سے منع فرما دیتے جیسا کہ ایک کتاب اصلاح مفاہیم کے لیے لکھی گئی ایک تقریظ پر آپ نے تائیدی دستخط فرما دیئے تھے لیکن جب حقیقت کھلی کہ اس کتاب میں بدعات کی ترویج ہے تو اس سے مکمل بیزاری کا اعلان شائع کیا۔

**تنبیہ**: یہ بات پیش نظر رہے کہ تاریخ کی کتابیں حدیث نہیں ہیں۔ ہمارا طریقہ یہ ہے کہ ہم قرآن و حدیث کی روشنی میں اہلسنت کے عقیدے کو مقدم رکھتے ہیں اور تاریخ کی جو باتیں اس عقیدے کے خلاف جاتی ہیں وہ پرکاہ کے برابر بھی حیثیت نہیں رکھتیں۔

## پہلا اعتراض

# حضرت حسین ؓ کا اعلیٰ مقصد اور اس سے ان کی دستبرداری

### حافظ صاحب کے بقول حضرت حسین ؓ کا اعلیٰ مقصد

اس کو خود مصنف ہی کے الفاظ میں پڑھیئے:

i- ایک وقت آیا کہ اسلام کے سیاسی نظام کو آلودہ کیا گیا۔ امت کے امتی ڈھانچے کو اموی ڈھانچے میں بدلنے کی کوشش کی گئی، عوام کی آزادی کو سلب کیا گیا اور شاہ خدا بننے لگا تو اب حقیقت کے ظہور کا وقت آ پہنچا! قربانی معنی کی تہہ سے ابھری کہ اب ٹکر معنوی الہ سے تھی (امام حسین اور واقعہ کربلا ص 54)

ii- اخلاص جتنا زیادہ ہو قربانی اتنی ہی مقبول ہوتی ہے اور مقصد جتنا اعلیٰ ہو قربانی اتنی ہی اعلیٰ اور اولی ہوتی ہے۔ (ایضاً ص 55)

iii- امام حسین ؓ نے اسی مرحلے پر خلافت کی بقا اور احیا کے لیے قربانی دی۔ (ایضاً ص 56)

iv- تاریخ انسانی کی دو قربانیاں نہایت عظمت و اہمیت رکھتی ہیں۔ ایک ابراہیم علیہ السلام و اسماعیل علیہ السلام کی قربانی اور دوسری امام حسین ؓ کی

## قربانی............

دوسری عظیم قربانی کا سبب بھی ایک خواب تھا۔

علی بن الحسین بن علی سلام اللہ ورضوانہ علیہم سے روایت ہے کہ جب روکنے والوں نے روکا تو امام حسینؓ نے سب باتوں کے جواب میں ایک بات فرمائی:

میں نے رسول اللہ ﷺ کو خواب میں دیکھا ہے۔ آپ ﷺ نے تاکید کے ساتھ اس میں مجھے ایک کام کا حکم دیا ہے۔ اب بہرحال میں یہ کام کروں گا مجھے نقصان ہو یا فائدہ۔

پوچھنے والوں نے پوچھا: وہ خواب کیا ہے؟

فرمایا............ ”ابھی تک کسی کو نہیں بتلایا اور نہ ہی بتلاؤں گا یہاں تک کہ اپنے رب عزوجل سے جاملوں گا......“

تو امام حسینؓ کو خواب میں جو امر ملا وہ درحقیقت امر الٰہی تھا اور اس کی تعمیل فرض عین“ (امام حسین اور واقعہ کربلا ص 69 تا 71)

### ہم کہتے ہیں

حافظ صاحب کی تحریر کے ان اقتباسات کا حاصل یہ ہے کہ حضرت حسینؓ کا اعلیٰ مقصد خلافت کا احیاء تھا اور اس کے لیے وہ صرف رسول اللہ ﷺ کی طرف سے ہی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی مامور تھے اور امر و حکم بھی ان پر فرض عین تھا۔

واضح رہے کہ اردو میں اس موضوع پر لکھنے والے حضرات عام طور سے اس خواب اور حکم کو

ذکر نہیں کرتے اس لیے جب وہ آگے ذکر کئے گئے دو واقعات نقل کرتے ہیں تو ان کے بیان پر وہ اعتراض وارد نہیں ہوتے جو آگے حافظ صاحب کے بیان پر ہم نے ذکر کئے ہیں۔

لیکن مصنف نے تاریخ سے دو واقعات ایسے قلمبند کئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت حسین ؓ اپنے اعلیٰ مقصد کو بھول بیٹھے اور اس سے دستبرداری پر آمادہ ہو گئے۔ وہ واقعات یہ ہیں:

پہلا واقعہ: قادسیہ کے قریب حر نے حضرت حسین ؓ سے کہا: آپ لوٹ جائیے کوفہ کے حالات آپ کے سازگار نہیں۔

آپ نے واپسی کا ارادہ کر لیا، حضرت مسلم بن عقیل ؓ کے بھائی آپ کے ہمراہ تھے، انہوں نے کہا واللہ ہم واپس نہیں جائیں گے، انتقام لیں گے یا ہم بھی قتل ہو جائیں گے۔

اس پر حسین ؓ نے فرمایا: تمہارے بعد جی کر مجھے کیا لینا ہے! یہ کہہ کر وہ (کوفہ کی سمت) روانہ ہوئے (امام حسین اور واقعہ کربلا: ص 42)

مصنف کے اس اقتباس سے معلوم ہوا کہ حر سے ملاقات کے بعد حضرت حسین ؓ نے واپسی کا ارادہ فرمایا جو ان کے مقصد سے دستبرداری پر دلیل ہے اور پھر کوفہ کی طرف سفر کو جاری رکھا تو اس وجہ سے کہ مسلم بن عقیل کے بھائیوں کا ارادہ مسلم کا انتقام لینے کا بن گیا تھا اور حضرت بھی مجبوراً ان کے ساتھ ہو لیے تھے۔

دوسرا واقعہ: آپ (حضرت حسینؓ) نے ابن سعد سے کہا: دیکھو ان تین باتوں میں سے کوئی ایک بات مان جاؤ۔

(1) مجھے چھوڑ دو کہ جہاں سے آیا ہوں وہیں واپس چلا جاؤں۔

(2) یا مجھے یزید کے پاس جانے دو۔

(3) یا مجھے چھوڑ دو کہ میں کسی سرحد پر چلا جاؤں۔ (ایضاً ص43)

مصنف کی کتاب کے اس اقتباس سے بھی ظاہر ہوا کہ حضرت حسینؓ نے مذکورہ تین تجویزیں دے کر گویا ایک مرتبہ پھر اپنے اعلیٰ مقصد اور اپنے اوپر عائد فرض عین سے دستبرداری اختیار کی۔

ہمارے اس اعتراض پر پہلے واقعہ کے بارے میں حافظ صاحب یہ جواب لکھتے ہیں:

امام حسینؓ اپنے پورے سفر میں اپنے مقصد سے غافل یا دستبردار نہیں ہوئے۔ حالات بدلنے سے تدبیر بدلنا ترک مقصود نہیں عین حکمت ہے "الا متحرفا لقتال او متحیزا الی فئة (انفال:16) خود قرآن حکیم نے فرمایا ہے۔

امام حسین ان بدلے ہوئے حالات میں غالباً اپنی تدبیر بدلنا چاہتے تھے لیکن حضرت مسلم کے بھائیوں نے یہاں انتقام کی بھی بات کی۔ یہ جوش انتقام مبنی برحق تھا، اس سفر حق کے لیے مفید تھا اس لیے امامؓ اب اپنے اعلیٰ مقصد میں اس جوش حق کو بھی شامل فرما کر روانہ ہوئے" ......

امام حسینؓ کے ارشاد مذکور سے یہ تاثر لینا کہ حضرتؓ مجبوراً ان کے ساتھ ہو لیے تھے نہایت ناروا اور نازیبا ہے۔ یہ امامؓ کی عظمت اور شخصیت سے ناواقفی کا

مظہر ہے۔(اقرار مودت ص 6)

## ہم کہتے ہیں

حضرت حسین ؓ کے بارے میں یہ تاثر ہم نے از خود نہیں بنایا بلکہ حافظ صاحب کا بیان اس کا سبب ہے اور اس وجہ سے ہمیں اعتراض ہے کہ وہ حضرت حسین ؓ کی شان کو گھٹا رہا ہے بڑھا نہیں رہا۔کوئی ذرا سا بھی غور کرے تو وہ سمجھ لے گا کہ حافظ صاحب کی مذکورہ بالا صفائی حضرت حسین ؓ کی شان کو مزید گھٹاتی ہے۔اس کی مندرجہ ذیل تین وجوہ ہیں۔دیکھئے:

1- حافظ صاحب نے لکھا ہے:

"جب روکنے والوں نے روکا تو امام حسین ؓ نے سب باتوں کے جواب میں ایک بات فرمائی: میں نے رسول اللہ ﷺ کو خواب میں دیکھا ہے۔آپ ﷺ نے تاکید کے ساتھ اس میں مجھے ایک کام کا حکم دیا ہے۔اب بہر حال میں یہ کام کروں گا مجھے نقصان ہو یا فائدہ۔"

حضرت حسین ؓ کے اس کلام سے یہ بات سامنے آئی کہ خاص اس موقع پر ہی نکلنا حکم نبوی اور حکم الٰہی تھا۔روکنے والوں نے بھی اسی وجہ سے روکا تھا کہ حالات سازگار نہیں اور حضرت علی ؓ کے ساتھ کوفہ کے لوگوں کا رویہ اس کی واضح دلیل ہے لیکن حضرت حسین ؓ نے حکم الٰہی اور فرض عین کو پورا کرنے کی خاطر کسی کے روکنے کو قبول نہیں کیا۔پھر حافظ صاحب کے بیان کے مطابق جب حر نے بتایا کہ مسلم بن عقیل شہید کر دیئے گئے ہیں اور کوفہ کے حالات آپ کے سازگار نہیں ہیں تو آپ نے واپسی کا ارادہ کر لیا۔حافظ صاحب نے نہ اپنی کتاب میں اور نہ اپنے کتابچہ "اقرار مودت" میں نشاندہی کی کہ حضرت حسین ؓ تدبیر کی کیا تبدیلی چاہتے تھے۔شاید وہ یہ ہو کہ واپس جا کر حالات کے سازگار ہونے کا انتظار کریں لیکن یہ تو تب ہو سکتا تھا جب حضرت حسین ؓ فائدے اور نقصان کا لحاظ کرتے۔جب حافظ صاحب کے بیان کے مطابق حضرت حسین ؓ یہ کہہ کر کہ "اب بہر حال میں یہ کام کروں گا مجھے نقصان ہو یا فائدہ" سو جب وہ سود و زیاں کے دائرے سے نکل ہی چکے تھے تو پھر اسی دائرے میں پلٹنے کو کہنا عزیمت کے خلاف اور اصل حکم سے دستبرداری نہیں تو کیا ہے؟

2- حافظ صاحب نے نقل کیا کہ:

''حضرت حسین ؓ نے واپسی کا ارادہ کر لیا۔ حضرت مسلم بن عقیل کے بھائی آپ کے ہمراہ تھے انہوں نے کہا کہ واللہ ہم واپس نہیں جائیں گے انتقام لیں گے یا ہم بھی قتل ہو جائیں گے۔ اس پر حضرت حسین ؓ نے فرمایا: ''تمہارے بعد جی کر مجھے کیا لینا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ کوفہ کی سمت روانہ ہوئے۔

حافظ صاحب تاریخ کی روایتوں کو ان کے مقام سے زیادہ حیثیت دیتے ہیں اس لیے وہ ہم پر اعتراض کرتے ہیں اور ہم پر حضرت حسین ؓ کی عظمت اور شخصیت سے ناواقفی کا الزام لگاتے ہیں۔ حافظ صاحب کے بیان کے مطابق حضرت حسین ؓ نے تدبیر یعنی حکمت عملی بدلنا چاہی لیکن حضرت مسلم بن عقیل کے بھائی جن میں پہلے ہی قربانی کا جذبہ تھا ان کے جوش وجذبہ میں انتقام کی طلب کی وجہ سے کچھ اضافہ دیکھا تو مزید اقدام کے لیے حضرت حسینؓ نے اسی کو کافی سمجھا۔ لیکن حافظ صاحب نے یہ خیال نہیں فرمایا کہ اس طرح سے:

i- ان کے بیان میں الجھاؤ پیدا ہو گیا۔ ان کے بقول بدلے ہوئے حالات تقاضا کر رہے تھے کہ حضرت حسین ؓ واپس چلے جائیں اور حالات کے سازگار ہونے کا انتظار کریں لیکن پھر حافظ صاحب کے بقول ''ساتھیوں کے جوش انتقام'' کو دیکھ کر حضرت حسین ؓ نے سمجھ لیا کہ حالات پھر ان کے موافق و سازگار ہو گئے ہیں۔ حافظ صاحب خود ہی غور فرمائیں کہ کیا چند ساتھیوں کا جوش انتقام ایک حکومت اور فوج سے ٹکر لینے کے لیے کافی تھا اور کیا اس کو حکمت عملی کہتے ہیں۔ وہ تاریخ کی باتوں کو ان کے مقام سے زیادہ درجہ دیں گے تو اعتراض تو خود بخود اٹھیں گے۔

ii- حضرت حسین ؓ کے یہ الفاظ ''تمہارے بعد جی کر مجھے کیا لینا ہے'' مایوسی اور بیکسی پر دلالت کرتے ہیں حالانکہ اللہ اور اس کے رسول کے حکم کو پورا کرنا بذات خود ایک بڑا مقصد اور بڑا ہدف ہوتا ہے اور اس ہدف کو حاصل کرنے کا جذبہ اللہ والوں کے خون کو گرم رکھتا ہے اگرچہ کوئی بھی ان کے ساتھ نہ رہے۔

3- اسلام میں قتل ہونے یا کئے جانے کی دو صورتیں ہیں:

i- جہاد اور اصلاح دینی کے لیے قربانی۔ اس پر انتقام، دیت یا قصاص کچھ نہیں ہوتا۔

قربانی دینے والے کو اللہ کے ہاں اجر ملتا ہے۔ کتنے ہی صحابہ ﷺ مظلوم شہید ہوئے لیکن ان کا انتقام نہیں لیا گیا۔ حضرت مسلم بن عقیل کا قتل بھی اسی قبیل سے تھا۔ اگر خیال ہو کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عثمان ﷺ کے شہید کئے جانے کی خبر سن کر بیعت رضوان لی تھی تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس وقت حضرت عثمان ﷺ ایک اسلامی حکومت کے سفیر بن کر گئے تھے اور سفیر کو قتل کرنا کسی کے نزدیک بھی جائز نہیں تھا۔

ii- آپس کے جھگڑوں میں یا خطا سے قتل۔ اس میں قصاص اور دیت کا معاملہ ہوتا ہے جس پر عمل درآمد حکومت کے ذریعہ ہوتا ہے۔

## دوسرا واقعہ اور حافظ صاحب کی صفائی

ہمارے اعتراض پر دوسرے واقعہ کے بارے میں حافظ صاحب لکھتے ہیں:

> ''میدان کربلا میں بھی آپ ﷺ نے تین باتوں کی جو پیشکش فرمائی یہ اعلیٰ مقصد سے دستبرداری نہیں تھی بلکہ ظالم کے مقابل تدبیر و حکمت تھی اور اتمام حجت تھا۔''

## جواب

ان تین باتوں میں اعلیٰ مقصد کے لیے تدبیر و حکمت کیسے تھی حافظ صاحب نے نہ اپنی کتاب میں اس کا کچھ ذکر کیا اور نہ ہی اپنے کتابچے ''اقرار مودت'' میں اس کی کچھ نشاندہی کی:

یہ پیشکش کہ مجھے چھوڑ دو جہاں سے آیا ہوں وہیں واپس چلا جاؤں اور یہ پیشکش کہ مجھے چھوڑ دو کہ میں کسی سرحد پر چلا جاؤں ان میں زیادہ سے زیادہ یہ تدبیر و حکمت ہوسکتی ہے کہ حالات سازگار ہونے تک وہاں رہیں گے اور جب بھی حالات سازگار ہوں گے تو اقدام کریں گے۔ لیکن ان باتوں میں ایک تو اس کی ضمانت نہیں کہ حضرت حسین ﷺ کی حیات ہی میں حالات ضرور سازگار ہو جائیں گے اور حضرت حسین ﷺ اپنے اوپر عائد فرض عین کو ضرور پورا کر لیں گے۔ دوسرے قربانی تو ہوتی ہی اس وقت ہے جب حالات غیر موافق ہوں۔ موافق حالات میں امتثال امر تو ہوسکتا ہے لیکن قربانی نہیں۔

رہی تیسری پیشکش کہ مجھے یزید کے پاس جانے دو اس میں البتہ یہ حکمت ہوسکتی ہے کہ

اس کے سامنے حضرت حسین ؑ کلمہ حق کہتے اور اتمام حجت کرتے لیکن پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت حسین ؑ کو خواب میں جو حکم ملا تھا وہ کیا تھا۔ کیا صرف اتمام حجت تھا یا خلافت کا بالفعل احیاء تھا۔ اگر صرف اتمام حجت تھا تو وہ تو خط و کتابت کے ذریعہ بھی ہو سکتا تھا اور اس کے لیے کوفہ والوں کی حمایت اور ان کے تائیدی خطوط کی ضرورت نہ تھی اور نہ ہی کوفہ جانے کی ضرورت تھی بلکہ سیدھے شام کی طرف جاتے۔ اور اگر حکم خلافت کے بالفعل احیاء کا تھا، تو نہ تو بالفعل یہ مقصد حاصل ہوا اور نہ ہی یہ بندے کی قدرت میں ہے کہ وہ جب چاہے کوئی انقلاب برپا کر دے۔

دوسرا اعتراض

# قربانی کا انوکھا فلسفہ

مصنف نے حضرت حسین ﷛ کی قربانی کو حضرت اسماعیل ؈ کی قربانی کے ساتھ جوڑا ہے۔ لکھتے ہیں:

1- ابراہیم ؈ کے خواب کی تعبیر دس ذوالحجہ کو پوری ہوئی اور حسین ﷛ کا خواب دس محرم کو تعبیر آشنا ہوا۔ دونوں خوابوں کی تعبیر قربانی تھی۔ اس لیے کہنے کو تو یہ دو خواب ہیں لیکن فی الحقیقت ایک ہی خواب ہے۔ دس ذوالحجہ کو میدان منی میں یہ خواب اپنے ظاہر میں رونما ہوا اور دس محرم کو سرزمین کربلا پر اپنی باطنی حقیقت کے ساتھ جلوہ گر ہوا۔ یوں باپ نے جس طرز قربانی کا آغاز کیا تھا بیٹے نے پوری تابانیوں کے ساتھ اس عظیم سنت کو مکمل کیا:

اللہ اللہ بائے بسم اللہ پدر معنی ذبح عظیم آمد پسر

(ص 71......امام حسینؓ اور واقعہ کربلا)

2- اسماعیل ؈ سے جس سنت کی ابتدا ہوئی تھی حسین ﷛ پر اس کی انتہا ہوئی (ص 72......امام حسین اور واقعہ کربلا)

3- قربانی کا یہ سفر ہابیل سے شروع ہوا اور کئی مرحلوں سے گزرتا ہوا منیٰ میں پہنچا۔ میدان منیٰ میں ابراہیم واسماعیل علیہ السلام کی قربانی سے قربانی کو زندگی ملی، تابندگی ملی، اعتبار ملا، قرار ملا...... لیکن حقیقت فدیے کے پردے میں مستور رہی، قربانی کا معنیٰ تو پایا گیا لیکن اس معنیٰ کو ظاہر کا لباس نہ ملا۔ کیونکہ ایک طرف جذبہ قربانی کارفرما تھا تو دوسری طرف دعائے ابراہیمی اپنا کام کررہی تھی: **ربنا و اجعلنا مسلمین لک و من ذریتنا امة مسلمة لک** اور **ربنا و ابعث فیھم رسولا منھم.**

اسماعیل پہلے ذبیح قرار پائے اور قربانی کا سفر جاری رہا۔

الا اللہ کی چوکھٹ پر دوسری عظیم قربانی ابراہیم علیہ السلام و اسماعیل علیہ السلام ہی کے فرزند عبدالمطلب نے اپنے بیٹے عبداللہ کی دی لیکن یہ قربانی بھی معنیٰ کی تہہ سے ابھر کر ظاہر کی سطح پر نہ آسکی کیونکہ ابھی دعائے خلیل جلوہ گر نہ ہوئی تھی۔ سیدنا عبداللہ اس سلسلے کے دوسرے ذبیح ٹھہرے۔ آپ ﷺ فرمایا کرتے تھے **انا ابن الذبیحین** (میں دو ذبیحوں کا فرزند ہوں)۔

پھر دعائے خلیل ﷺ اپنی پوری رعنائیوں اور زیبائیوں کے ساتھ جلوہ افروز ہوئی اور قربانی کا سفر جاری رہا۔ ایک وقت آیا کہ اسلامی نظام کو آلودہ کیا گیا۔ امت کے امتی ڈھانچے کو اموی ڈھانچے میں بدلنے کی کوشش کی گئی، عوام کی آزادی کو سلب کیا گیا اور شاہ خدا بننے لگا تو اب حقیقت کے ظہور کا وقت آپہنچا!

قربانی معنیٰ کی تہہ سے ابھری کہ اب ٹکر معنوی الہ سے تھی!

ظاہر کا لباس پہنا اور ملوکیت کا بت پاش پاش کر ڈالا!

یوں میدان منیٰ سے قربانی کا یہ سفر سینکڑوں منزلوں سے گزرتا ہوا ہزاروں برس بعد میدان کربلا میں ابراہیم واسماعیل کے فرزند امام حسین اور اہل بیت کی قربانی پر نقطہ کمال کو پہنچا اور اس شان سے پہنچا کہ اب قیامت تک یہی قربانی حق وصداقت کا معیار قرار پائی اور نئے مسافروں کے لیے یہی قربانی نشان منزل ٹھہری۔ (ص 54)

4۔ اس لیے ابراہیم نے اپنی ذریت میں جس امام کی درخواست کی تاریخ کی روشنی میں انبیاء کے بعد اس کا سب سے بڑا مصداق سیدنا حسین ﷺ قرار پاتے ہیں۔ (ص 92...... امام حسینؓ اور واقعہ کربلا)

<u>ہم کہتے ہیں</u>

مصنف کی ان عبارتوں میں مندرجہ ذیل غلطیاں ہیں:

1۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مذکورہ دعا ذبح کے واقعہ کے بعد کی ہے اس لیے مصنف کا یہ کہنا کہ قربانی کا معنی تو پایا گیا لیکن اس معنی کو ظاہر کا لباس نہ ملا کیونکہ ایک طرف جذبہ قربانی کارفرما تھا تو دوسری طرف دعائے ابراہیمی اپنا کام کر رہی تھی درست نہیں ہے۔

2۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا میں امام سے مراد رسول و نبی ہیں۔ غیر نبی بھی اس میں شامل ہوں یہ محل نظر ہے۔

3۔ مصنف کی عبارتوں میں اضطراب ہے جو یہ ہے:

i۔ ''یوں باپ نے جس طرز قربانی کا آغاز کیا تھا بیٹے نے پوری

تابانیوں کے ساتھ اس عظیم سنت کو مکمل کیا۔"

ii- "اسماعیل علیہ السلام سے جس سنت کی ابتدا ہوئی تھی حسین پر اس کی انتہا ہوئی۔"

ان دو جملوں میں آغاز اور ابتدا کے الفاظ سے متبادر ہوتا ہے کہ مکمل کرنے اور انتہا ہونے سے مراد خاتمہ کو پہنچنا ہے۔ اگر ان سے یہی مراد ہے تو یہ بات بداہتہً غلط ہے کیونکہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے بعد بھی اہل بیت میں سے نفس ذکیہ رحمہ اللہ (حافظ صاحب نے توجہ دلائی کہ ذال کے بجائے ز ہے) اور حضرت زید شہید رحمہ اللہ نے تحریکیں برپا کیں اور شہید ہوئے۔

اور اگر ان سے مراد نقطہ کمال کو پہنچنا ہے جیسا کہ اس جملہ میں ہے "یوں میدان منیٰ سے قربانی کا یہ سفر سینکڑوں منزلوں سے گزرتا ہوا ہزاروں برس بعد میدان کربلا میں ابراہیم علیہ السلام و اسماعیل علیہ السلام کے فرزند امام حسین اور اہل بیت کی قربانی پر نقطہ کمال کو پہنچا" (امام حسین اور واقعہ کربلا) تو اس میں ایک اولوالعزم رسول کے عمل کے ساتھ ایک غیر نبی کے عمل کا تقابل ہے اور غیر نبی کے عمل کو رسول کے عمل پر فائق بتانا ہے حالانکہ غیر نبی کا کوئی بھی عمل اور اس کی کوئی بھی قربانی رسول کے عمل و قربانی کا مقابلہ کہاں کر سکتی ہے؟

ہماری اس بات کے جواب میں حافظ صاحب اقرار مودت میں لکھتے ہیں۔

اگر نقطہ کمال مراد ہو تو اس میں غیر نبی کے عمل کا نبی کے عمل سے تقابل ہے نہ تفاوق اس لیے کہ ابتدا و انتہا میں تقابل کی نسبت نہیں ہوتی......اور پھر امام حسین رضی اللہ عنہ کو غیر نبی کیوں کہا جا رہا ہے آپ تو جزو نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرمایا حسین منی و انا من حسین. ہاں یہ

ضرور ہے کہ آپ منصب نبوت پر فائز نہیں۔

## ہم کہتے ہیں

اس عبارت میں مصنف نے یہ دعوی کیا ہے کہ انہوں نے حضرت حسینؓ کی قربانی کو حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قربانی پر فائق نہیں بتایا۔ اس کے جواب میں حافظ صاحب کی عبارت دوبارہ ملاحظہ فرمایئے ''یوں میدان منی سے قربانی کا یہ سفر سینکڑوں منزلوں سے گزر کر ہزاروں برس میدان کربلا میں ابراہیم واسماعیل کے فرزند امام حسین اور اہلبیت کی قربانی پر نقطہ کمال کو پہنچا''۔

کیا نقطہ کمال کا لفظ تقابل اور تفاوق پر دلالت نہیں کرتا؟

## تیسرا اعتراض

# حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور انقلاب

مصنف نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو امام انقلاب کہا ہے اور واقعہ کربلا کو انقلاب کہا۔ یہ انقلاب کیا تھا؟ مصنف لکھتے ہیں:

1۔ واقعہ کربلا ایک واقعہ نہیں، انقلاب ہے اور حسینؓ امام انقلاب ہیں (امام حسین اور واقعہ کربلا ص 31)

حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے کس قسم کا انقلاب برپا کیا؟ اس کا جواب مصنف یہ دیتے ہیں:

2۔ اصلاح امت کی مصلحت نے خلافت کو صلح کے ذریعے امام حسنؓ کے ہاتھ سے لے کر دوسرے ہاتھوں میں منتقل کر دیا۔ ہاتھ بدلنے سے رفتہ رفتہ نظام بدل گیا، طرز اہتمام بدل گیا، مزاج بدل گیا، منہاج بدل گیا، خلافت دب گئی اور ملوکیت چھا گئی۔

امام حسین رضی اللہ عنہ نے اسی مرحلے پر خلافت کی بقا اور احیاء کے لیے قربانی دی۔ نظام خلافت تو قائم نہ رہ سکا لیکن دائرہ خلافت ضرور متعین ہو گیا، حدود واضح ہو گئیں، مزاج خلافت سے سب آشنا ہو گئے، منہاج خلافت

سب کے لیے روشن ہو گیا۔ (ص 56)

3- ان حالات میں تنہا امام حسین ؑ تھے جنہوں نے ملوکیت کے مفاسد کا فوری ادراک کیا، عزیمت کی راہ اپنائی اور اس کے انسداد کے لیے بروقت قیام فرمایا اور قیام بھی اس شان سے کہ امت کو جنگ و جدال کی تباہی سے بچایا اور خود اپنی اور اپنے گھرانے کی قربانی دے کر خلافت و ملوکیت اور حق و باطل کے درمیان فرق بھی امت کو سمجھا دیا، چنانچہ میدان کربلا میں امام حسین ؑ اقدام نہیں کرتے بلکہ تا دمِ آخر دفاع میں تلوار اٹھاتے ہیں......

آپ کی قربانی کے بعد امت میں بیداری کی لہر دوڑ گئی، ملوکیت سے نفرت گہری ہو گئی لا إلٰہ الا اللہ کے مفہوم کی وسعت لوگوں پر آشکارا ہو گئی اور چند ہی برس میں اس کا مثبت نتیجہ بھی سامنے آ گیا۔

آج جب شعور کی آنکھ کھلی ہے، عوام کو اپنے حقوق کا احساس ہوا ہے، آمریت و ملوکیت کا جوا لوگ اپنے کندھوں سے اتار کر پھینک رہے ہیں اور جبر و استبداد کی بیڑیاں توڑ رہے ہیں تو ہر قوم پکار رہی ہے، حسین ہمارے ہیں۔ (امام حسین اور واقعہ کربلا ص 65، 66)

4- امام حسین ؑ کے اقدام سے واضح ہوتا ہے کہ یہ حدود خلافت کے تعین و تشخص کا عہد تھا۔ (ص 74)

5- 60 ھ میں خلافت کی بساط لپیٹ دی گئی اور ملوکیت کی بنیادیں رکھی گئیں تو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر لازم ہو گیا۔ اس سنگین دور میں

یہ سعادت امام حسین ﷜ کا مقدر ٹھہری کہ آپ ایمانی جذبے سے کھڑے ہوئے اور اس برائی کے انسداد کے لیے جو آپ سے بن پڑا آپ نے کیا۔ (ص 86)

6- اگر امام حسین ﷜ قیام نہ فرماتے تو ملوکیت کو سند جواز مل جاتی جیسے موسیٰ علیہ السلام قیام نہ فرماتے تو فرعونیت قائم رہتی۔ (ص 87)

هم کہتے ہیں

مصنف کی ان عبارتوں سے معلوم ہوا کہ حضرت حسین ﷜ نے جو انقلاب برپا کیا وہ یہ تھا کہ دائرہ خلافت متعین ہوا، خلافت کی حدود واضح ہوئیں، مزاج خلافت سے سب آشنا ہو گئے اور منہاج خلافت سب کے لیے روشن ہو گیا۔

یہاں ہم مصنف سے دو سوال کرتے ہیں:

سوال نمبر 1- حضرت حسین ﷜ کی قربانی ہمیں تسلیم ہے لیکن مصنف نے جو دعویٰ کیا ہے تو کیا وہ واضح کریں گے کہ دائرہ خلافت کس کو کہتے ہیں ؟ اور خلافت کی حدود کیا ہیں اور کیا حضرت حسین ﷜ کے حوالے سے کسی فقیہ نے ان کا ذکر کیا ہے؟

اس کے جواب میں حافظ صاحب نے سوال کچھ جواب کچھ کے مصداق یہ لکھا ہے جو بے فائدہ بات ہے۔

''خلافت کا انعقاد کیسے ہوتا ہے؟ خلافت راشدہ کیا ہے؟ ہماری تاریخ میں اس کے ادوار کون سے ہیں؟ حدیث، فقہ اور کلام کی کتب میں یہ ابحاث بکھری ہوئی ہیں۔'' (اقرار مودت ص 12)

سوال نمبر 2- ایک اور سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت حسن ؓ کی خلافت سے دستبرداری اور حضرت معاویہ ؓ کے حکمران بننے کے بعد خود حدیث کی رو سے خلافت ختم ہو کر ملوکیت قائم ہو گئی تھی۔ خود مصنف ان حدیثوں کو بیان کرتے ہیں:

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اسلامی حکومت کا آغاز تو نبوت و رحمت سے ہوا ہے، پھر خلافت و رحمت کا دور آئے گا، پھر ایسی ملوکیت ہوگی جس میں ظلم اور اذیت پائی جائے گی، پھر ملوکیت سراسر جبر و قہر تکبر اور فساد فی الارض ہو جائے گی...... (ص 296 امام حسین ؓ اور واقعہ کربلا)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا خلافت تیس برس رہے گی پھر ملوکیت ہوگی۔ ص 298 امام حسین اور واقعہ کربلا)

پھر ملا علی قاریؒ رقمطراز ہیں: حسن ؓ کے چھ ماہ ملا کر خلافت تیس سال پر ختم ہو گئی، معاویہ ؓ کا دور خلافت میں شامل نہیں ہے۔ (ص 298 امام حسین ؓ اور واقعہ کربلا)

مصنف کی ذکر کی گئی ان سب باتوں سے تو بڑا حرف آتا ہے کہ پندرہ بیس سال تک منہاج خلافت تاریک تر ہوتا چلا گیا، مزاج خلافت سے لوگ نا آشنا ہوتے گئے اور ملوکیت چھاتی چلی گئی لیکن حضرت حسن ؓ تو خود اس کا سبب بنے کہ انہوں نے خلافت سے دستبرداری اختیار کی اور امت کو ملوکیت کی پٹڑی پر چڑھا دیا اور حضرت حسین ؓ بھی یہ سب کچھ ہوتا دیکھتے رہے۔ ملوکیت کا تو خاصہ ہی ہے کہ وہ نسل در نسل چلتی ہے۔

جب اس خاصہ کا ظہور ہونے لگا اور ملوکیت کے مستحکم ہونے کے بعد اب جب پھل آنے لگا تو اس وقت قیام کرنا کیا مفید ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت حسین ؓ کے قیام فرمانے سے کوئی تبدیلی نہ آئی اور ملوکیت روز بروز پختہ ہونے لگی یہاں تک کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ بھی اس کو نہ بدل سکے۔

ہمارے اس سوال پر حافظ صاحب لکھتے ہیں:

''امام حسن ؓ ملوکیت کا سبب بنے نہ انہوں نے امت کو ملوکیت کی پٹڑی پر چڑھایا۔ انہوں نے تو امت کے عظیم مفاد میں اپنے منصب سے دستبرداری اختیار کی ایسا حضور پر نور ﷺ کی پیشگوئی کے مطابق ہوا، امام حسن ؓ نے خلافت سپرد کی اور اس کی حفاظت کے لیے صلح نامہ میں شرائط بھی رکھیں۔ اب خلافت کی حفاظت ان کی ذمہ داری تھی جن کے ہاتھ میں زمام خلافت تھی۔ پھر رنگ بدلنا شروع ہوا یہاں تک کہ یزید کی ولی عہدی سے ملوکیت کی بنیاد پڑی، اکابر صحابہ ؓ نے جن کی سیاست پر نظر تھی اور ان میں امام حسین بھی شامل تھے اس وقت اسے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا اور یہیں سے کشمکش کا آغاز ہوا یہاں تک کہ واقعہ کربلا'' رونما ہوا۔ امام حسین ؓ کے اقدام سے فوری تبدیلی تو نہیں آئی لیکن سب کو پتا چل گیا کہ ہم غلط راہ پر چل پڑے ہیں چنانچہ خلافت کی راہ پر پلٹنے کی کوششیں ہوتی رہیں اور آج تک امت میں خلافت راشدہ کی جو طلب ہے وہ امام حسین ؓ کی قربانی کا ہی ثمر ہے......

معترض کو یہ الجھن خلافت وملوکیت کی پیشگوئی پر مشتمل احادیث سے ہوئی کہ جب معلوم تھا تو انہوں نے خلافت کیوں دی؟ (اقرار مودت ص 14)

## ہم کہتے ہیں

ہمیں تو کوئی الجھن نہیں ہوئی البتہ حافظ صاحب نے جو فلسفہ بیان کیا ہے وہ ضرور الجھا ہوا

ہے۔ مثلاً حافظ صاحب لکھتے ہیں:

''پیشگوئی کا مطلب یہ نہیں کہ تم ان حالات کو روکو، روکنا کسی کے بس میں نہیں ہوتا ورنہ پیشگوئی ہی غلط ہو جائے! پیشگوئی کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ تم ان حالات میں حق اور باطل کو پہچان لو اور اپنے لیے سیدھی راہ تلاش کرلو۔ اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ پیشگوئی یاد نہیں رہتی جب واقعہ ہو چکتا ہے تو یاد آتی ہے''۔ (اقرار مودت ص 14)

حافظ صاحب کی اس عبارت کو حضرت حسینؓ پر منطبق کیا جائے تو عجیب وغریب نتائج نکلیں گے۔ حافظ صاحب نے اپنی کتاب ''امام حسین اور واقعہ کربلا کے ص 56 پر یہ لکھا ہے کہ ''امام حسینؓ نے اس مرحلے پر خلافت کی بقا اور احیاء کے لیے قربانی دی۔ اب اس وقت یا تو حضرت حسینؓ کو خلافت کے تیس سال بعد ملوکیت کے ہونے والی حدیث معلوم اور یاد ہوگی یا نہ ہوگی۔ اگر یاد تھی تو وہ ملوکیت کو روک نہ سکتے تھے اور علم وشعور کے ہوتے ہوئے انہوں نے خلافت کی بقا و احیاء کے لیے اپنی قربانی ضائع کی۔ اور ان کو جو نبوی اور خدائی حکم ملا وہ بھی معاذ اللہ الٹا ملا۔ اور اگر حضرت حسینؓ کو وہ حدیث یاد نہ رہی تھی تو یہ ایک قسم کی کوتاہی ہوئی جس کی وجہ سے انہیں نقصان ہوا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ یہ غلط نتیجے ہم پیدا نہیں کر رہے بلکہ حافظ صاحب کے دیے ہوئے فلسفہ اور فکر کی پیداوار ہیں۔ ورنہ ہم حضرت حسین ؓ کے بارے میں اچھا گمان رکھتے ہیں۔ آگے ہم حافظ صاحب کے فلسفہ وفکر کے الجھاؤ کو دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں:

ہم فقہ، حدیث اور کلام کی کتابوں میں خلافت کے انعقاد کے طریقوں کو دیکھتے ہیں تو حضرت معاویہ ؓ کی خلافت جس طرح سے منعقد ہوئی وہ خلافت راشدہ کے انعقاد کے تینوں طریقوں سے مختلف استیلاء کا یعنی غلبہ و تسلط کا طریقہ ہے جس سے معلوم ہوا کہ حضرت معاویہ ؓ کی حکومت شروع دن سے ہی خلافت راشدہ نہیں تھی۔

حضرت مولانا ادریس کاندھلوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

'پھر حضرت علی ؓ کی شہادت کے بعد حضرت امام حسن خلیفہ ہوئے۔ تھوڑی مدت خلیفہ رہے اور تیس سال کے اختتام پر جب راشدہ کی مدت پوری ہوگئی تو حضرت معاویہ کے حق میں

برضا ورغبت خلافت سے دستبردار ہو گئے۔ (خلاصۃ العقائد ص ۱۰۶)

## خلافت راشدہ کے انعقاد کے تین طریقے

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''خلافت کا انعقاد چار طریقوں سے ہوتا ہے پہلا طریقہ اہل حل وعقد کی بیعت ہے۔ حضرت ابوبکرؓ کی خلافت اس طریقے سے منعقد ہوئی۔ دوسرا طریقہ استخلاف کا ہے جس سے حضرت عمرؓ کی خلافت منعقد ہوئی اور تیسرا طریقہ شوریٰ کا ہے جس سے حضرت عثمانؓ خلیفہ بنے۔ (ازالۃ الخفاء ص 5)

مذکورہ بالا تین طریقے خلافت راشدہ کے انعقاد کے ہیں۔ ان کے علاوہ چوتھا طریقہ استیلاء اور تغلب کا ہے۔ لکھتے ہیں۔

## استیلاء وتغلب کا طریقہ

طریق چہارم استیلاست چون خلیفہ بمیرد وشخصے متصدی خلافت گردد بغیر بیعت واستخلاف وہمہ را برخود جمع سازد باتیلاف قلوب یا بقہر ونصب قتال خلیفہ شود ولازم گردد بر مردمان اتباع فرمان او درانچہ موافق شرع باشد وایں دو نوع ست

یکے آنکہ مستولی مستجمع شروط باشد وصرف منازعین کند بصلح وتدبیر از غیر ارتکاب محرمے وایں قسم جائز ست ورخصت۔ وانعقاد خلافت معاویہ بن ابی سفیان بعد حضرت مرتضیٰ وبعد صلح امام حسن ہمیں نوع بود۔

دیگر آنکہ مستجمع شروط نباشد وصرف منازعین کند بقتال وارتکاب محرم وآں جائز نیست و فاعل آن عاصی ست لیکن واجب ست قبول احکام او چوں موافق شرع باشد واگر عمال او اخذ زکوۃ کنند از ارباب اموال ساقط شود وچوں قاضی او حکم نماید نافذ گردد حکم او وہمراہ او جہاد متیوان کرو۔ وایں انعقاد بنابر ضرورت است زیرا کہ در عزل او افنائے نفوس مسلمین وظہور ہرج ومرج شدید لازم می آید وبیقین معلوم نیست کہ ایں شدائد مفضی شود بصلاح یا نہ محتمل کہ دیگرے بدتر از اول غالب شود...... وانعقاد خلافت عبدالملک بن مروان واول خلفائے بنی عباس ہمیں نوع بود۔

(چوتھا طریقہ استیلا یعنی تغلب کا ہے مثلا جب خلیفہ کی وفات ہو جائے اور ایک شخص بیعت واستخلاف کے بغیر خلافت کے حصول کے در پے ہو جائے اور رعایا کے دلوں کو لبھا کر یا قہر و جنگ سے ان کو اپنا ہموا بنا کر خلیفہ بن جائے اور ان پر اپنے حکم کی تابعداری کو لازم کر دے جب کہ وہ شریعت کے موافق ہو۔ استیلا کی پھر دو قسمیں ہیں۔

1- ایسا شخص غلبہ حاصل کرلے جس میں خلافت کی تمام شرائط موجود ہوں اور کسی حرام کا ارتکاب کئے بغیر محض صلح اور حسن تدبیر سے مخالفین کو رام کرلے تو یہ جائز ہے۔ حضرت علی ؓ کے بعد اور حضرت حسن ؓ سے صلح کے بعد حضرت معاویہ ؓ کی خلافت اسی نوع کی تھی۔

2- ایسے شخص میں خلافت کی تمام شرائط نہ ہوں۔ اور وہ جنگ اور حرام اقدامات کے ذریعہ مخالفین کو اپنی راہ سے ہٹا دے۔ یہ طریقہ جائز نہیں اور یہ شخص گناہگار ہے لیکن لوگوں پر واجب ہے کہ اس کے جو احکام شریعت کے موافق ہوں ان کی تابعداری کریں اور اگر اس کے عمال لوگوں سے زکوۃ وصول کریں تو وہ ادا شمار ہوگی اور جب اس کے مقرر کئے ہوئے قاضی فیصلے دیں تو وہ نافذ ہوں گے اور جب وہ جہاد کا اعلان کرے تو لوگ اس کا ساتھ دیں۔ اس شخص کی خلافت کا انعقاد ضرورت و مجبوری کی وجہ سے ہے کیونکہ اس کو معزول کرنے میں بہت سے مسلمانوں کی ہلاکت ہوگی۔ اور پھر بھی یقین نہیں کہ ان مشقتوں اور شدائد کے بعد حالات سدھریں گے یا نہیں اور احتمال ہے کہ کوئی دوسرا غالب آجائے جو اس سے بھی بدتر ہو...... عبدالملک بن مروان اور خلفائے بنو عباس کے شروع کے خلیفہ کی خلافت کا انعقاد اسی طریقے سے ہوا تھا۔)

شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی اس عبارت سے معلوم ہوا کہ حضرت حسن ؓ کی خلافت سے دستبرداری میں اگرچہ انہوں نے خلافت راشدہ چھوڑی لیکن حضرت معاویہ ؓ کو خلافت راشدہ نہیں ملی بلکہ ملوکیت ملی کیونکہ ان کی حکومت کا انعقاد استیلاء سے ہوا۔

## ملوکیت کب شروع ہوئی؟

شاہ صاحب رحمہ اللہ کی بات سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ملوکیت کی ابتدا حضرت معاویہ ؓ کی حکومت شروع ہوتے ہی ہوئی اس لیے حافظ صاحب کی یہ بات درست نہیں کہ ''یزید کی ولی عہدی سے ملوکیت کی بنیاد پڑی''۔ (اقرار مودت ص 14) اور حافظ صاحب کی یہ بات بھی

درست نہیں کہ ''ہاتھ بدلنے سے رفتہ رفتہ نظام بدل گیا، طرز اہتمام بدل گیا، مزاج بدل گیا، منہاج بدل گیا، خلافت دب گئی اور ملوکیت چھا گئی کیونکہ یہ خلافت راشدہ سے ملوکیت کا سفر رفتہ رفتہ اور بتدریج نہیں ہوا بلکہ یکدم چھلانگ لگی ہے۔ ہاں یہ کہہ سکتے ہیں کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی دستبرداری سے پہلے ہی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا ملوکیت کی طرف سفر جاری تھا جو حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی دستبرداری سے منزل مقصود پر پہنچا۔

ہمیں حیرت ہے کہ حافظ صاحب اس الجھاؤ کی طرف نہیں دیکھتے جس کی طرف ہم نے پہلے بھی نشاندہی کی اور اب پھر کی ہے۔ دیکھئے اوپر ہم نے حافظ صاحب کا نقل کردہ ایک حوالہ ذکر کیا تھا کہ ملا علی قاری رحمہ اللہ رقمطراز ہیں: حسن رضی اللہ عنہ کے چھ ماہ ملا کر خلافت تیس سال پر ختم ہوگئی۔ معاویہ رضی اللہ عنہ کا دور خلافت میں شامل نہیں ہے۔ (ص 298 امام حسین اور واقعہ کربلا)

لیکن اس کے باوجود حافظ صاحب پھر بھی یہ لکھتے ہیں:

''60ھ میں خلافت کی بساط لپیٹ دی گئی اور ملوکیت کی بنیادیں رکھی گئیں۔''

آخر اس کو ہم الجھاؤ نہ سمجھیں تو کیا سمجھیں۔

## حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی ملوکیت کا قیام

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قصاص کے مدعی تھے اور ان کو بھی یہی خیال ہوا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنی پالیسی کے باعث قصاص میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔ مزید بریں ہوسکتا ہے ان کو یہ بھی خیال ہوا ہو کہ اہل شام نے ابھی تک حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کی بیعت نہیں کی ہے لہٰذا حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت ابھی مکمل نہیں ہوئی اور ان سے اختلاف کرنا جائز ہے۔ بہرحال یہ سب کچھ ایک دینی مسئلہ کے طور پر انہوں نے سمجھا۔

عَنْ أَبِیْ مُسْلِمِ الْخَوْلَانِی أَنَّهُ قَالَ لِمُعَاوِيَةَ أَأَنْتَ تُنَازِعُ عَلِيًّا فِی الْخِلَافَةِ أَنْتَ مِثْلُهُ قَالَ لَا وَإِنِّی لَأَعْلَمُ أَنَّهُ أَفْضَلُ مِنِّیْ وَ أَحَقُّ بِالْأَمْرِ وَلٰكِنْ أَلَسْتُمْ تَعْلَمُوْنَ أَنَّ عُثْمَانَ قُتِلَ مَظْلُوْمًا وَأَنَا ابْنُ عَمِّهٖ وَ وَلِيُّهٗ أَطْلُبُ بِدَمِهٖ فَأْتُوْا عَلِيًّا فَقُوْلُوْا لَهٗ يَدْفَعُ لَنَا قَتَلَةَ عُثْمَانَ فَأَتَوْهُ فَكَلَّمُوْهُ فَقَالَ يَدْخُلُ فِی الْبَيْعَةِ وَيُحَاكِمُهُمْ إِلَیَّ فَامْتَنَعَ مُعَاوِيَةُ.

(شرح مواھب لدنیہ، زرقانی)

ابو مسلم خولانی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے کہا تم خلافت کے

بارے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جھگڑنے چلے ہو۔ کیا تم علی رضی اللہ عنہ کے برابر ہو۔ معاویہ رضی اللہ عنہ نے کہا (میں ان کے برابر ہرگز) نہیں اور میں بلاشبہ جانتا ہوں کہ وہ مجھ سے افضل ہیں اور مجھ سے زیادہ خلافت کے حقدار ہیں۔ لیکن کیا تمہیں معلوم نہیں کہ عثمان رضی اللہ عنہ مظلوماً قتل کر دیئے گئے۔ میں ان کا چچازاد بھائی اور ولی ہوں اور ان کے خون کا بدلہ چاہتا ہوں۔ تم ان سے جا کر کہو کہ وہ قاتلین عثمان کو ہمارے حوالہ کر دیں۔ (تاکہ ہم ان کو قصاص میں قتل کر دیں)۔ چنانچہ لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور ان سے اس سلسلہ میں گفتگو کی تو آپ نے فرمایا وہ (پہلے میری خلافت کی) بیعت میں داخل ہو جائیں پھر قاتلین عثمان کا معاملہ میرے سامنے رکھیں۔ لیکن یہ بات حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے نہیں مانی۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا اپنی رائے پر اصرار رہا بلکہ اس وجہ سے پھر ان کی رائے یہ ہوئی کہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ اس پر آمادہ نہیں ہیں تو وہ خلافت سے دستبردار ہو جائیں اور خلافت کو مسلمانوں کی شوریٰ کے سپرد کر دیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء میں نقل کرتے ہیں۔

اور کلام عبدالرحمٰن بن غنم اشعری فقیہ شام چون ابو ہریرہ و ابو درداء از نزدیک حضرت مرتضیٰ برگشتند وایشان میانجی بودند میان معاویہ وحضرت مرتضیٰ، ومعاویہ طلب میکرد کہ خلافت بگوارد وشوریٰ گرداند درمیان مسلمین۔

فَكَانَ مِمَّا قَالَ لَهُمَا عَجَبًا مِنكُمَا كَيْفَ جَازَ عَلَيْكُمَا مَجِيئُتُمَا بِهِ تَدْعُوَانِ عَلِيًّا أَنْ يَجْعَلَهَا شُورىٰ وَقَدْ عَلِمْتُمَا أَنَّهُ قَدْ بَايَعَهُ الْمُهَاجِرُونَ وَالْأَنصَارُ وَأَهْلُ الْحِجَازِ وَالْعِرَاقِ وَ أَنَّ مَنْ رَضِيَهُ خَيْرٌ مِمَّنْ كَرِهَهُ وَمَنْ بَايَعَهُ خَيْرٌ مِمَّنْ كَرِهَهُ وَمَنْ بَايَعَهُ خَيْرٌ مِمَّمْ لَمْ يُبَايِعْهُ وَأَيُّ مَدْخَلٍ لِمُعَاوِيَةَ فِي الشُّورىٰ وَهُوَمِنَ الطُّلَقَاءِ الَّذِينَ لَايَجُوزُ لَهُمُ الْخِلَافَةُ وَهُوَ وَأَبُوهُ رُءُوسُ الْأَحْزَابِ فَنَدِمَا عَلىٰ مَسِيرِهِمَا وَتَابَا بَيْنَ يَدَيْهِ.

جب حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس سے پلٹ کر آئے اور یہ دونوں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مابین درمیانی واسطہ تھے اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا مطالبہ تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ خلافت سے دستبردار ہو کر اس معاملہ کو مسلمانوں میں

شوریٰ کے سپرد کر دیں تو فقیہ شام حضرت عبدالرحمٰن بن غنم نے ان دونوں حضرات سے کہا آپ جو کچھ کر رہے ہیں اس پر تعجب ہے۔ آپ کے لیے یہ کیسے جائز ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس بات کی دعوت دیں کہ وہ معاملہ شوری کے سپرد کر دیں جب کہ آپ کو علم ہے کہ حضرت علی سے مہاجرین وانصار اور اہل حجاز وعراق بیعت کر چکے ہیں اور جو حضرات علی رضی اللہ عنہ کو (بطور خلیفہ) پسند کرتے ہیں وہ ان لوگوں سے بہتر ہیں جو ان کو (بطور خلیفہ) نہیں چاہتے اور جن لوگوں نے ان سے بیعت کی ہے وہ ان لوگوں سے بہتر ہیں جنہوں نے ان سے بیعت نہیں کی۔ اور معاویہ کا بھلا شوریٰ میں کیا دخل ہے وہ تو طلقاء میں سے ہیں (جو فتح مکہ کے موقع پر اسلام لائے اور اس وقت ضعیف الایمان تھے اور) جو خلافت کے اہل نہیں اور معاویہ اور ان کے باپ (ابوسفیان) تو غزوہ احزاب (یعنی خندق) میں کفار کے سربراہ تھے (تو اگر چہ اب یہ اہل ایمان ہیں اور صحابی بھی ہیں لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دیگر مہاجرین وانصار کے برابر نہیں بلکہ درجہ میں ان سے بہت پیچھے ہیں۔ یہ سن کر دونوں حضرات نے ان کے سامنے اپنی آمد پر ندامت کا اظہار کیا اور اس بات سے رجوع کیا۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اپنے اجتہاد اور اپنی رائے پر قائم رہے اور اپنے موقف ہی کو درست اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خطا پر سمجھتے رہے اور جیسے جیسے وقت گزرتا گیا ان کے موقف میں سختی آتی گئی اور وہ یہ خیال کر کے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے باغی اور قاتل حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فوج میں داخل ہیں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ ان کے خلاف کوئی اقدام کرنے پر تیار نہیں ہیں اور اگر ہم نے بیعت بھی کر لی تو بیعت کے بعد بھی ان کے خلاف کوئی اقدام نہ کریں گے جب کہ ہم باغیوں اور قاتلوں سے قصاص لے سکتے ہیں اور ان کی سرکوبی کر سکتے ہیں وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ حضرت علیؓ کے مقابلہ میں ہم خلافت کے زیادہ حقدار ہیں کیونکہ ہم خلافت کی اس وقت کی یہ ذمہ داری پوری کر سکتے ہیں۔ جنگ صفین کے بعد ایک موقع پر انہوں نے کہا:

فَلَنَحْنُ أَحَقُّ بِهِ مِنْهُ وَمِنْ أَبِيْهِ. (بخاری)

بلاشبہ ہم خلافت کے علی اور ان کے والد سے زیادہ حقدار ہیں۔

اس کے جواب میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے سوچا کہ یہ کہیں

أَحَقُّ بِهٰذَا الْأَمْرِ مِنْكَ مَنْ قَاتَلَكَ وَقَاتَلَ أَبَاكَ عَلَى الْإِسْلَامِ. (بخاری)

(تم سے زیادہ خلافت کا حقدار تو وہ شخص ہے (یعنی حضرت علی ؓ) جس نے تم سے اور تمہارے باپ سے اسلام کی خاطر جنگ کی تھی ۔)

لیکن مزید انتشار کے ڈر سے نہیں کہا۔ اور حضرت عبداللہ بن عمر ؓ ہی کی بات درست تھی: اور حضرت معاویہ ؓ کی خطا اجتہادی کی وجہ سے ان کا حضرت علی ؓ کے خلاف خروج ناحق تھا اس کی دلیل یہ حدیث بھی ہے تقتلک الفئة الباغية جس میں رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمار بن یاسر ؓ کو فرمایا کہ تم کو باغی جماعت قتل کرے گی اور یہ جماعت حضرت معاویہ ؓ کی فوج تھی ۔ اور وہ ناحق خروج جو کسی خلیفہ عادل یا خلیفہ راشد کے خلاف ہو اگر چہ اجتہاد کی بنیاد پر ہی ہو شریعت کی اصطلاح میں بغاوت کہلاتا ہے۔

حضرت معاویہ ؓ کے اس اجتہاد کی وجہ سے جنگ صفین کی نوبت آئی اور پھر حضرت حسن ؓ کے دور میں بھی معرکہ آرائی کی تیاریاں ہوئیں ۔ لیکن پھر مسلمانوں کی خونریزی سے بچنے کے لیے حضرت حسن ؓ نے حکومت حضرت معاویہ ؓ کے سپرد کر دی ۔ اگر چہ اس میں خلافت راشدہ سے دستبرداری تھی اور ملوکیت کا دروازہ کھلتا تھا لیکن مجبوری کی وجہ سے اسی میں مسلمانوں کی مصلحت تھی اور چونکہ حضرت حسنؓ نے مصالحت میں کسی شرعی حکم کی مخالفت نہیں کی تھی بلکہ رسول اللہ ﷺ پیشگی ہی ان کے اس عمل کی تحسین فرما گئے تھے تو معلوم ہوا کہ کسی عادل بادشاہ و حاکم کی حکومت جائز ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے پہلے مذکور کلام میں بھی یہی ذکر تھا۔

یزید کی ولی عہدی کی تجویز پر حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر ؓ نے اعتراض کیا کہ یہ تو ہرقل اور کسریٰ کا طریقہ ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر ؓ نے ابتدا میں بیعت کرنے سے انکار کیا اور کہا کہ جب اور سب لوگ یزید کی بیعت پر جمع ہو جائیں گے تو میں بھی بیعت کرلوں گا اور بعد میں بیعت کر بھی لی۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ یزید کو خلافت کا اہل نہیں سمجھتے تھے اور انہوں نے مجبوری سے بیعت کی۔ حضرت حسین اور حضرت عبداللہ بن زبیر ؓ نے یزید کو خلافت کے لیے نااہل سمجھتے ہوئے اس کو کبھی خلیفہ تسلیم نہیں کیا اور اس کے لیے بیعت نہیں کی۔

حدیث میں مذکورہ تیس سال کی خلافت راشدہ کے بعد مسلمانوں میں جو خلافت کی اصطلاح چلی اس سے ان کی بین الاقوامی حکومت مراد تھی اگر چہ ماہیت کے اعتبار سے وہ

ملوکیت ہی تھی۔ البتہ ملوکیت کے دور میں عادل حکمران عادل بھی آتے رہے جیسے حضرت معاویہ ؓ، حضرت عبداللہ بن زبیر ؓ اور حضرت عمر بن عبدالعزیز جن کی حکومت عادلہ تو تھی لیکن خلافت راشدہ یا خلافت علی منہاج النبوہ نہ تھی۔ کیونکہ اس کا انعقاد ان طریقوں پر نہیں تھا جو خلافت راشدہ کے تھے۔

ان حالات میں اہل کوفہ کی طلب پر حضرت حسین ؓ خلافت راشدہ کے نظام کے احیاء کے لیے نہیں نکلے تھے بلکہ یزید کی نا اہل یا فاسق حکومت کے خلاف اٹھے تھے تاکہ خود برسر اقتدار آ کر حکومت عادلہ یا خلافت عادلہ قائم کریں جیسا کہ بعد میں حضرت عبداللہ بن زبیر ؓ نے قائم کی۔

یہ کہنا کہ ان حضرات کی نیت اپنی حکومت قائم کرنا نہیں تھی بلکہ صرف خلافت راشدہ کے نظام کو بحال کرنے کی نیت تھی حقیقت سے انحراف ہے کیونکہ:

i- حضرت حسین ؓ اور حضرت عبداللہ بن زبیر ؓ کو معلوم ہوگا کہ رسول اللہ ﷺ نے بتایا تھا کہ خلافت راشدہ کی مدت تیس سال ہوگی اور اس کے بعد ملوکیت ہوگی۔ اور اس طرح سے ملوکیت کو قائم ہوئے بیس سال گذر چکے ہیں۔ تو کیا رسول اللہ ﷺ کی پیش گوئی کے خلاف ہونا ممکن ہے؟

ii- اللہ تعالیٰ نے بعض لوگوں کے مزاج میں سرداری رکھی ہوتی ہے اور ان کا سرداری اور حکومت کو قبول کرنا یا اصلاح احوال کی خاطر خود اس کی طرف پیش قدمی کرنا ناجائز بھی نہیں جیسا کہ:

1- حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا: **اجعلنی علی خزائن الارض انی حفیظ علیم.** (مجھے زمین کے خزانوں پر مقرر کر دو بلاشبہ میں حفاظت کرنے والا جاننے والا ہوں)

2- حضرت عمرؓ نے اپنی شہادت کے وقت خلافت کے لیے چھ نام دئے۔ ان میں سے چار حضرات کی دستبرداری کے بعد جب حضرت عثمان ؓ اور حضرت علی ؓ کے درمیان خلافت دائر ہوئی تو حضرت عبدالرحمٰن بن عوف ؓ کے مطالبہ کے باوجود دونوں میں سے کسی ایک نے بھی دستبرداری کو اختیار نہیں کیا۔ البتہ جب حضرت عبدالرحمٰن بن عوف ؓ نے حضرت عثمان ؓ کے حق میں فیصلہ دیا تو حضرت علی ؓ نے اسے نیک نیتی سے قبول کیا اور ادنی مزاحمت بھی نہیں کی۔ وجہ یہی تھی کہ دونوں حکمرانی کا مزاج رکھتے تھے اور سمجھتے تھے کہ وہ بہتر

حکمرانی کر سکتے ہیں۔

مذکورہ بالا وجوہات کو پیش نظر رکھ کر حضرت حسین ؓ اور حضرت عبداللہ بن زبیر ؓ نے علیحدہ علیحدہ اقدام کیا اور دونوں کا اقدام جہاد تھا کیونکہ ان کا خیال تھا کہ یزید اور بعد والے حکمران حکومت کرنے کے اہل نہیں اور ان کے غیر شرعی کاموں کی وجہ ان کے خلاف خروج جائز ہے۔ حضرت حسین ؓ کے ساتھ یہ المیہ ہوا کہ وہ کوئی باقاعدہ فوج لے کے نہیں نکلے تھے۔ بچوں، عورتوں سمیت کچھ افراد تھے جو مظلومانہ شہید کیے گئے۔

حافظ صاحب نے دعویٰ کیا کہ حضرت حسین ؓ خلافت راشدہ کے احیاء کے لیے اٹھے تھے۔ اس پر جو اعتراض ہوئے حافظ صاحب نے ان کو سمجھا نہیں اور بلاوجہ ہم پر یہ اعتراض کر دیا کہ ہم نے جو لب ولہجہ اپنایا ہے وہ سراسر ناصبیوں کا ہے۔

چوتھا اعتراض

# حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا انقلاب اور شیعہ فکر

## پہلا نکتہ

مصنف لکھتے ہیں کہ:

"آپ کی قربانی کے بعد امت میں بیداری کی لہر دوڑ گئی، ملوکیت سے نفرت گہری ہو گئی اور لا الہ الا اللہ کے مفہوم کی وسعت لوگوں پر آشکارا ہو گئی۔"

ہم کہتے ہیں:

اب کوئی حافظ صاحب سے پوچھے کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ ملوکیت سے نفرتِ گہری ہو جانے کے باوجود ملوکیت ہی کیوں گہری اور مزید گہری ہوتی چلی گئی اور لا إلـہ الا للہ کا وہ کونسا مفہوم تھا جو امت سے پوشیدہ رہا اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی قربانی سے آشکارا ہوا۔

حافظ صاحب نے اپنے کتابچے اقرار مودت میں اس کا یہ جواب دیا کہ یہ مفہوم تھا کہ لا حاکم الا اللہ۔ (ص 15)

حافظ صاحب کی یہ بات درست نہیں کیونکہ لا حاکم الا اللہ کے مطلب میں دو

احتمال ہیں:

1- انسانوں کے ظاہری حاکم صرف اللہ تعالیٰ ہیں۔ یہ بات تو بدیہی البطلان ہے کیونکہ انسانوں کے ظاہری حکمران اور خلیفہ تو انسان ہی رہے ہیں۔

2- حکم دینے کا حق صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔ خیر القرون میں ایسا کون مسلمان ہوگا جس کے دماغ سے کبھی یہ عقیدہ اوجھل ہوا ہو۔ یزید کے دور میں بھی اور بعد کے خلفاء کے دور میں بھی عدالتوں میں شریعت کا قانون ہی رائج تھا۔ ہاں فاسق حکمران اپنی من مانی کرتے تھے تو ایسا نہیں ہوا کہ امت نے اس کو کبھی جائز سمجھا ہو۔

## دوسرا نکتہ

حافظ صاحب لکھتے ہیں:

''آج جب شعور کی آنکھ کھلی ہے عوام کو اپنے حقوق کا احساس ہوا ہے آمریت و ملوکیت کا جوا لوگ اپنے کندھوں سے اتار کر پھینک رہے ہیں اور جبر و استبداد کی بیڑیاں توڑ رہے ہیں تو ہر قوم پکار رہی ہے کہ حسین ہمارے ہیں''۔

ہم کہتے ہیں

یہ تو محض لفاظی ہے۔ کیا سید احمد شہید رحمہ اللہ نے یہ صدا لگائی تھی اور افغانستان میں طالبان کی حکومت قائم ہوئی تو کیا انہوں نے یہ پکار لگائی کہ حسین ہمارے ہیں یا کسی اور مسلمان ملک سے یہ صدا بلند ہوئی۔ ہاں ایران کی شیعی حکومت کے قائم ہو جانے کے بعد یہ نعرہ شیعہ ضرور لگاتے ہیں جیسا کہ مصنف نے ایک شیعہ شاعر محسن نقوی کا یہ شعر نقل کیا ہے۔

انسان کو بیدار تو ہو لینے دو
ہر قوم پکارے گی ہمارے ہیں حسین

**ہماری اس بات پر حافظ صاحب لکھتے ہیں:**

''آج دنیا میں جہاں بھی حریت انسانی کی بات ہوتی ہے، مزاحمت کا حوصلہ ہوتا ہے، کلمہ حق کہنے کی جرأت ہوتی ہے اس کی پشت پر امام حسین رضی اللہ عنہ کھڑے ہوتے ہیں خواہ کوئی اسے تسلیم کرے یا نہ کرے اس کی صدا لگائے یا نہ لگائے ............ الغرض تمام مجاہدین وسالکین شروع سے اب تک قولاً اور عملاً یہ کہتے چلے آئے ہیں کہ حسین رضی اللہ عنہ ہمارے ہیں۔ بالفرض کوئی نہ کہے جب حضور ﷺ نے کہہ دیا کہ حسین میرا ہے اور میں حسین کا ہوں تو کسی اور کے کہنے کی کیا حاجت؟

کیا بدبختی ہے کہ جو نعرہ سرکار دو عالم ﷺ نے لگایا آج کہا جا رہا ہے کہ یہ نعرہ شیعہ کا ہے اور کیا حرمان نصیبی ہے کہ آج اپنے پرائے سب حسین رضی اللہ عنہ سے جڑنے کی کوشش کر رہے ہیں اور معترض جڑے ہوؤں کو ان سے توڑنے کی کوشش کر رہے ہیں ...........

معترض نے شعر مذکور کے بارے میں کہا ہے کہ یہ محسن نقوی کا ہے۔ فقیر کا چیلنج ہے کہ ثابت کریں کہ یہ شعر محسن نقوی کا ہے۔ بالفرض اگر محسن نقوی کا بھی ہو تو کیا محسن نقوی کی ہر بات اور ہر شعر غلط ہوتا ہے؟''

## ہم کہتے ہیں

1- حافظ صاحب کا رسول اللہ ﷺ کے فرمان (حسین میرا ہے اور میں حسین کا ہوں) کو نعرہ لگانے سے تعبیر کرنا غیر مناسب ہے۔

2- ایک صاحب علم کے بتانے پر کہ یہ شعر محسن نقوی کا ہے ہم نے یہ بات لکھ دی تھی۔ حافظ صاحب کے کہنے پر ہم مان لیتے ہیں کہ یہ کسی اور کا شعر ہے۔ حافظ صاحب سے ملاقات میں ہم نے ان سے شاعر کا نام پوچھا تھا لیکن انہوں نے نہیں بتایا۔ ہمیں بھی اس کی اتنی ضرورت

نہیں کیونکہ یہ شعر خود شیعہ فکر پر واضح دلیل ہے اور وہ اس طرح کہ اہلسنت تو ہمیشہ سے اہلبیت کی قربانیوں کے اور ان کی سیادت کے اور ان کے مناقب کے قائل رہے ہیں۔ حضرات حسنین ﷺ سے لے کر مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہ اللہ تک اور ان کے بعد بھی قرب قیامت تک ان کی علمی، روحانی، اور سیاسی سیادت کو مانتے ہیں اور اس کو اپنے لیے مشعل راہ اعتقاد کرتے ہیں۔ اس اعتقاد سے اہلسنت سوئے ہوئے نہیں ہیں جو یہ کہنے کی ضرورت پیش آئے کہ انہیں بیدار تو ہو لینے دو۔

## تیسرا نکتہ

شیعوں کی تو مجبوری ہے کیونکہ ان کے پاس لے دے کر صرف حضرت حسین ﷺ کا نام اور واقعہ کربلا ہے۔ یہی ان کے مذہب کی بنیاد ہے۔ اسی مضمون کو ایک شاعر نے یوں تعبیر کیا ہے اور مصنف نے اسے نقل کیا ہے:

شاہ است حسین، بادشاہ است حسین
دین است حسین، دین پناہ است حسین
سرداد نہ داد دست در دست یزید
حقا کہ بنائے لا الہ است حسین ﷺ

لیکن ہم اہلسنت کی تو کوئی مجبوری نہیں۔ ہمارے لیے تو رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی بھی ہے، قرآن پاک بھی ہے، خلفائے راشدین بھی ہیں، صحابہ کی جماعت بھی ہے اور حضرات حسنین رضی اللہ عنہما سمیت اہلبیت بھی ہیں اور چودہ صدیوں کے ان گنت تابناک ستارے بھی ہیں۔

ہماری اس بات پر حافظ صاحب یوں تبصرہ کرتے ہیں:

''حیران ہوں کہ اس پیرا گراف میں معترض نے کیا کارنامہ کر دکھایا کہ شیعہ کو الزام دیتے دیتے اپنے مذہب پر تیشہ چلا دیا اور پھر شیعہ کو جو الزام دیا وہ بھی بے اصل۔ کیا واقعہ کربلا سے پہلے شیعہ نہیں تھے؟ کیا شیعہ رسول اللہ ﷺ کو نہیں مانتے؟ قرآنِ مجید کو نہیں مانتے؟ خلفائے راشدین میں سے کسی کو نہیں مانتے؟ جماعت صحابہ میں کسی کے قائل نہیں؟ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے سوا تمام اہل بیت کے منکر ہیں؟ اور کیا ان چودہ صدیوں میں ان کے ہاں نامور علماء وفقہاء نہیں ہوئے۔ اور جن ستاروں کو معترض ان گنت لکھ رہے ہیں، چند جلدوں میں ان کے احوال سمٹ جاتے ہیں تو ان گنت کیسے رہے؟ الغرض کوئی الزام تو صحیح ہو۔

پھر امام حسین رضی اللہ عنہ کی شخصیت کوئی معمولی شخصیت اور واقعہ کربلا کوئی معمولی واقعہ ہے کہ کہا جا رہا ہے ''ان کے پاس لے دے کر صرف حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا نام اور واقعہ کربلا ہے!'' (اقرار مودت ص 18)

## ہم کہتے ہیں

حافظ صاحب کے اس تبصرے پر ہمیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہر شخص اس تبصرے کو خود سمجھ سکتا ہے۔

## چوتھا نکتہ

مصنف کے بقول حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے برپا کئے انقلاب کا ثمرہ صرف قربِ قیامت میں ملے گا۔ مصنف لکھتے ہیں:

''یہ مسلمہ ہے کہ قربانی رائیگاں نہیں جاتی۔ نظام خلافت کے لیے دی گئی یہ عظیم قربانی بھی رائیگاں نہیں ہوئی اور نہ ہو سکتی ہے خلافت کے محفوظ، متعین اور مقرر نظام کا سفر جاری ہے۔ سینکڑوں برس گزر چکے اور نہ معلوم کتنے اور گزریں گے،

لیکن......ایک وقت ضرور آئے گا اور نبی صادق و مصدوق ﷺ کی پیش گوئی کے مطابق آئے گا، جب انہی ﷺ کی اولاد سے...... جن کے ہاتھ سے خلافت لی گئی اور جنہوں نے خلافت کی بقا کے لیے قربانی دی......ایک عظیم شخص پیدا ہوگا، نبی آخرالزماں کا ہم نام ہوگا......سراپا ہدایت ہوگا جس کی وجہ سے مہدی کے لقب سے پکارا جائے گا، اس وقت حالات مجبور ہوکر اس کے ہاتھ پر بیعت کریں گے بلکہ یوں کہا جائے کہ حالات نے جس ہاتھ سے خلافت لی، حالات ہی مجبور ہوکر اس کی اولاد کو، گویا اسی کو، خلافت واپس کریں گے۔

جب امانت اپنے صحیح مقام پر پہنچے گی اور حقدار کو اس کا حق ملے گا تو پھر ایک مرتبہ روئے زمین پر نظام خلافت برپا ہوگا اور وہ قرن آخر میں قرن اول کی طرح حالات کی اصلاح کرے گا......(امام حسین اور واقعہ کربلا ص 56)

ہم کہتے ہیں

ہمیں تشویش ہے کہ مصنف کی مذکورہ بالا باتیں اہلسنت کے افکار سے مطابقت نہیں رکھتیں بلکہ مذکورہ واقعات کے پس منظر میں شیعہ فکر نمایاں نظر آتی ہے۔

ہماری اس تشویش پر حافظ صاحب نے یوں اعتراض کیا ہے:

امام مہدی سلام اللہ و رضوانہ علیہ کی خلافت کے حوالے سے یہ نکتہ اور یہ فکر

انوکھی نہیں، مجھ سے پہلے حضرت مولانا مناظر احسن گیلانیؒ، حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ یہ نکتہ بیان کر چکے ہیں اور حضرت سید نفیس الحسینی نے تو یہ بات بارہا اپنی مجالس میں بیان فرمائی۔" (اقرار مودت ص 19)

## ہم کہتے ہیں

امام مہدی علیہ السلام کی شخصیت اور ان کے بارے میں جو تفصیل احادیث میں مذکور ہے اس پر ہمارا ایمان ہے لیکن جب مصنف کھل کر بات کو یوں بیان کریں:

"جب انہی کی اولاد سے...... جن کے ہاتھ سے خلافت لی گئی اور جنہوں نے خلافت کی بقا کے لیے قربانی دی...... ایک عظیم شخص پیدا ہوگا...... حالات نے جس ہاتھ سے خلافت لی حالات ہی مجبور ہو کر اس کی اولاد کو، گویا اسی کو خلافت واپس کریں گے۔

جب امانت اپنے صحیح مقام پر پہنچے گی اور حقدار کو اس کا حق ملے گا تو پھر ایک مرتبہ روئے زمین پر نظام خلافت برپا ہوگا"۔

حافظ صاحب کے یہ الفاظ "جب امانت اپنے صحیح مقام پر پہنچے گی اور حقدار کو اس کا حق ملے گا" شیعوں کے امام منتظر پر دلالت کرتے ہیں۔

پھر حافظ صاحب کبھی تو یہ کہتے ہیں کہ ملوکیت کی ابتدا یزید کی ولی عہدی سے ہوئی اور حضرت معاویہؓ کی حکومت کے پہلے پندرہ سال میں نظام خلافت ہی کا تھا اور پھر حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے بھی نظام خلافت قائم کیا۔ ان کے علاوہ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی حکومت کے خلافت ہونے میں بھی حافظ صاحب کو کچھ شک نہ ہوگا۔ یہ تینوں حضرات اہل بیت میں سے نہ تھے۔ تو کیا پھر بھی حافظ صاحب کی یہ بات کچھ وقعت رکھتی ہے کہ "حالات نے جس ہاتھ سے خلافت لی حالات ہی مجبور ہو کر اس کی اولاد کو، گویا اسی کو خلافت واپس کریں گے۔"

ظاہر ہے کہ نہیں اور اگر وقعت ہے تو شیعوں کے امام منتظر کے اعتبار سے ہے کیونکہ موروثی خلافت و امامت کا تصور ان کا ہے اہلسنت کا نہیں۔

اس کا بیان یہ ہے کہ امانت کا لفظ دلالت کرتا ہے کہ حضرت حسن ﷛ نے خلافت بطور

امانت کے حضرت معاویہ ﷺ کے سپرد کی تھی۔ اس کا مقتضیٰ یہ تھا کہ حضرت معاویہ ﷺ اپنی وفات کے وقت خلافت حضرت حسین ﷺ یا حضرات حسنین کی اولاد میں سے کسی کو دیتے تاکہ یہ کہا جا سکتا کہ انہوں نے خلافت گویا حضرت حسن ﷺ کو ہی واپس کی۔ جب حضرت معاویہ ﷺ نے ایسا نہیں کیا تو معلوم ہوا کہ حضرت معاویہ ﷺ اور ان کے بعد میں جتنی بھی مسلمان حکومتیں آئیں وہ سب امانت کو غصب کرنے کی وجہ سے خائن تھیں۔

علاوہ ازیں حقدار کے لفظ سے اگر خلافت کی صرف اہلیت مراد ہو تو معلوم ہونا چاہئے کہ اہلسنت کے نزدیک اہلیت میں قریشی ہونے کا تو ذکر ہے اہل بیت ہونے کا ذکر نہیں۔ اس لیے حضرت عبداللہ بن زبیر ﷺ اور حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ قریشی ہونے کی وجہ سے اہل اور حقدار تھے۔ اور اگر حقدار سے مراد اس کا اہل بیت ہونا ہے تو یہ صریح شیعہ حضرات کا قول ہے۔

## حافظ صاحب کا اعتراض

حافظ صاحب نے یہاں ہم پر ایک اعتراض یہ کیا ہے کہ ہم نے غیر نبی کے لیے عصمت کا دعویٰ کیا ہے حالانکہ وہ خاصہ نبوت ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''معترض نے داعیٔ اسلام مولانا طارق جمیل حفظہ اللہ پر جو تنقید لکھی ہے...... اس میں لکھا ہے:
>
> انبیاء علیہم السلام معصیت سے معصوم ہوتے ہیں۔ کوئی غیر نبی بھی معصیت سے معصوم ہو سکتا ہے یا نہیں؟ اس بارے میں شریعت خاموش ہے۔ پھر عبقات سے ایک طویل اقتباس ذکر کیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ غیر نبی بھی معصوم ہو سکتا ہے۔
>
> مسئلہ عصمت اہل سنت اور اہل تشیع کے درمیان بڑی وجہ نزاع ہے۔ اہل سنت کے ہاں اس پر اصرار ہے کہ عصمت خاصۂ نبوت ہے، حضور اکرم ﷺ خاتم المعصومین ہیں اور آپ ﷺ کے بعد کسی کے لیے اقرار عصمت اجراء نبوت کے مرادف ہے۔'' (اقرار مودت ص 20)

## جواب

اول تو جب ہم نے شاہ اسماعیل شہید رحمہ اللہ کا بعض غیر انبیاء کی عصمت پر کلام نقل کیا

ہے تو ہم پر اعتراض کیوں؟ دوسرے حافظ صاحب نے غور نہیں کیا کہ انبیاء اور غیر انبیاء کی معصیت سے عصمت وحفاظت میں فرق ہے۔ انبیاء علیہم السلام تو پیشگی ہی عصمت کے ساتھ متصف ہوتے ہیں۔ غیر نبی پیشگی اس کے ساتھ متصف نہیں ہوتے البتہ نص سے یا کردار کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ فلاں فلاں اصحاب سے معصیت کا صدور نہیں ہوتا یا نہیں ہوا۔

جب کہ ایسا ہونا ممکن ہے محال نہیں ہے۔ حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور حضرت علی رضی اللہ عنہم کی حفاظت وعصمت اسی قبیل سے تھی۔ شیعہ حضرات جو اماموں کو معصوم مانتے ہیں تو انبیاء کی طرح ان کو پیشگی معصوم مانتے ہیں۔

## پانچواں اعتراض:

# دسویں محرم کو سوگ منانا

مصنف لکھتے ہیں:

''ام الفضلؓ بیان کرتی ہیں کہ جن دنوں امام حسینؓ میری گود میں تھے، میں ایک دن رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور حسینؓ کو آپ کی گود میں رکھا، پھر جو میری توجہ ہوئی تو کیا دیکھتی ہوں کہ رسول اللہ ﷺ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔

میں نے عرض کیا: یا نبی اللہ! میرے ماں باپ آپ پر قربان، آپ کو کیا ہوا؟ فرمایا: جبریل علیہ السلام میرے پاس آئے اور مجھے بتلایا کہ میری امت میرے اس بیٹے کو قتل کرے گی۔

میں نے پوچھا: اسے؟ فرمایا: ہاں، اور اس کی تربت کی مٹی بھی لائے تھے، جو سرخ تھی'' (بیہقی، مشکوۃ: مناقب اہل بیتؓ)۔

سلمیٰؓ سے روایت ہے کہ ''میں ام المومنین ام سلمہؓ کے ہاں گئی تو وہ رو رہی تھیں۔

میں نے پوچھا: آپ رو کیوں رہی ہیں؟

فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا ہے، یعنی خواب میں، آپ ﷺ کے سر اور داڑھی پر مٹی ہے، میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! آپ کو کیا ہوا؟

فرمایا: "حسین قتل ہو گئے، میں ابھی وہاں تھا" (ترمذی، مشکوۃ: مناقب اہل بیتؓ)

اس سے معلوم ہوا کہ شہادت حسینؓ کا صدمہ معمولی صدمہ نہیں، آپ ﷺ وفات کے بعد بھی اس پر غمزدہ اور دکھی ہوئے۔

یہ واقعہ غم دس محرم کا ہے، اب باقی ایام کو چھوڑ کر دس محرم کو شادی کے لیے منتخب کرنا اور یہ دلیل دینا کہ شریعت میں اس روز شادی حرام نہیں ہے، نہایت درجہ بدذوقی اور سنگدلی ہے۔

دس محرم کو شادی یا کوئی تقریب مسرت ازراہِ شریعت تو جائز ہے، لیکن ازراہ محبت جائز نہیں ہے۔

فرض کیجیے کسی کا پورا خاندان نہایت ظلم اور جبر سے قتل کر دیا جائے، خواتین کی توہین کی جائے اور پھر اس کی دادرسی بھی نہ ہوئی ہو، تو کیا وہ شخص زندگی بھر اس روز کو، جس روز یہ سانحہ ہوا، شادی اور خوشی کے لیے منتخب کر سکتا ہے؟ جواب یقیناً نفی میں ہے۔ تو دس محرم رسول اللہ ﷺ کے غم و حزن کا دن ہے، اور رسول اللہ ﷺ کا غم ہم سب کا غم ہے!

<u>اضافہ</u>: اس مقام پر کچھ احباب نے مسئلہ تشبہ کی طرف توجہ دلائی، میں نے عرض کیا کہ اگر غم میں ایک فرقے سے تشبہ ہے تو خوشی میں دوسرے

فرقے سے، اور اس موقعے پر غم میں تشبہ اختیار کرنے میں ایمان کی سلامتی ہے، خوشی میں تشبہ ہلاکت اور بربادی ہے، اب فیصلہ خود کیجیے کہ آپ کس بات میں تشبہ اختیار کرتے ہیں؟

اور یہ مسئلہ تشبہ ایک نازک مسئلہ ہے، اس وقت جا بجا اس کا استعمال کیا جا رہا ہے، بات یہ ہے کہ کسی طبقے کی ہر ادا غلط نہیں ہوا کرتی، ورنہ آپ دین کی کتنی چیزوں کو اس تشبہ کی وجہ سے چھوڑنے پر مجبور ہو جائیں گے۔

اصل بات یہ ہے کہ گردش ایام کے اس مقام پر ہمارا غم کسی فرقے کی ہم آہنگی کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اس لیے ہے کہ اس دن خود رسول اللہ ﷺ غمناک ہوئے اور ہم آپ ﷺ کے غم میں شریک ہوتے ہیں۔ تعجب ہے کسی ہمسائے، کسی دوست کے غم میں شرکت کو تو آپ اخلاقی فرض سمجھتے ہیں، لیکن رسول اللہ ﷺ کے غم میں شرکت کو بدعت خیال کرتے ہیں۔

ذرا ناصبی سازش سمجھیے پہلے رسول اللہ ﷺ کے اہل بیت علیہم السلام کو تہ تیغ کیا پھر اس کارروائی کو خروج کے حکم سے شرعی جواز فراہم کیا، پھر اس ظلم پر اظہار غم کو بدعت قرار دیا اور آخر الامر ان ایام میں تقریبات مسرت کے انعقاد کو شریعت ٹھہرایا تا کہ یہ عظیم الشان قربانی اور اس کے مقاصد ذہنوں سے اوجھل ہو جائیں۔

کتنی سنگین سازش ہے جو شریعت کے عنوان سے پھیلائی گئی اور کتنے سادہ لوح ہیں وہ لوگ جو سنت کی محبت میں اس سازش کا شکار ہو جاتے ہیں!

کیا رسول اللہ ﷺ کا دل زخمی کرنے میں کوئی کمی رہ گئی تھی کہ اب اس سنگدلی سے پوری کی جارہی ہے؟

ان ایام غم میں تقریب مسرت کا انعقاد 22 رجب کو کونڈے بھرنے کی طرح ہے، شریعت میں 22 رجب کو کونڈے بھر کر صدقہ کرنے کی کہیں ممانعت نہیں ہے، تو کیوں روکا جاتا ہے اور خطبات و رسائل میں اس کی مذمت کی جاتی ہے؟ بس جس بنا پر وہاں منع کیا جاتا ہے اسی بنا پر یہاں منع کیا جارہا ہے۔

علاوہ ازیں مصائب اہل بیت رضی اللہ عنہم درحقیقت مصائب اسلام ہیں اور ان مصائب پر گریہ خود رسول اللہ ﷺ نے کیا، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کیا، امام ابوحنیفہؒ نے کیا اور ملا علی قاریؒ نے تو اس مذکورہ بالا روایت ام سلمہؓ کے ذیل میں امام احمد بن حنبلؒ کی سند سے یہ روایت ذکر فرمائی ہے:

(ترجمہ) ''حسنؓ بن علیؓ فرمایا کرتے تھے کہ ہمارے (غم) میں جس کی آنکھیں نمناک ہوئیں یا اس کی آنکھوں سے کوئی آنسو ٹپک پڑا تو اللہ عزوجل اسے جنت عطا فرمائے گا'' (مرقاۃ: /۳۹۱)

مجھے اس وقت اس روایت کی قوت یا ضعف سے بحث نہیں، جس درجے کا عمل ہے، اس کے لیے اتنی روایت بھی کافی ہے، میں تو بس یہ کہتا ہوں کہ یہ روایت بیان کرنے سے اگر امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ اور ملا علی قاریؒ اور اس سند کے تمام راوی بدعتی نہیں بنے، سنی ہی رہے تو میں بھی اسے نقل کرکے اور اس پر عمل کرکے سنی ہی رہوں گا، اور دور فتنہ کے سنیوں کی

نسبت قرون خیر کے ان اہل سنت کی رفاقت ہمارے لیے دنیا اور آخرت میں کافی ہے۔

غم امام ؑ کے ضمن میں ہمارا مجرمانہ رویہ

امام مظلوم ؑ کے غم میں آج تک جتنے آنسو بہائے گئے، اگر انہیں اکٹھا کیا جائے تو آنسوؤں کا فرات بہہ نکلے!

امام عالی مقام ؑ کے مصائب پر دلوں سے اٹھنے والی آہیں اگر مجسم ہوں تو آہوں کا ہمالیہ وجود میں آجائے!

امام مظلوم ؑ کے غم زدگان جمع ہو کر ہاتھوں کی زنجیر بنائیں تو پوری دنیا گھیرے میں ہو!

کاش آنسوؤں کے اس فرات میں طاغوتی نظام کو ڈبویا جاتا!

کاش آہوں کا یہ ہمالیہ عصر حاضر کے فرعونوں پر گرایا جاتا!

کاش ہاتھوں کی یہ زنجیر مظلوموں کی دستگیر بن کر ظالموں کو اسیر کرتی!

لیکن افسوس صد افسوس!

ہم نے امام ؑ متاع اسلام کی عظیم قربانی کو فرقہ بازی کی نذر کر دیا!

یہ غم بالائے غم اور ستم بالائے ستم ہے!

دکھ یہ ہے کہ وہ ستم غیروں نے کیا، یہ ستم اپنے کر رہے ہیں!

فانا للہ و انا الیہ راجعون. (امام حسینؓ اور واقعہ کربلا ص 129 تا 131)

ہم کہتے ہیں:

ہم نے اپنے پانچویں اعتراض کا عنوان یہ لگایا ''دسویں محرم کو سوگ منانا'' اور اس کے

ساتھ پانچواں اعتراض'' کے الفاظ بھی ہیں لیکن حافظ صاحب اس کے باوجود ہمیں الزام دیتے ہیں کہ ہم نے ان کے دیئے ہوئے عنوان کو بدل کر تحریف کی ہے۔

حافظ صاحب لکھتے ہیں:

''کتاب میں مضمون کا عنوان ہے: ''امام حسین ؓ کی شہادت پر خود رسول اللہ ﷺ غم زدہ ہوئے اور روئے'' اس عنوان سے معترض کا مقصد پورا نہیں ہوتا تھا، اس لیے انہوں نے اسے حذف کر دیا اور اس کی جگہ اعتراض کے جملے کو یوں لکھا گویا یہی عنوان ہے، حالانکہ پورے مضمون میں کہیں ''سوگ منانے'' کا لفظ تک نہیں ہے۔ اس کارروائی سے مقصد یہ ہے کہ قاری کو ایک خاص تاثر دے کر بھڑکایا اور بھٹکایا جا سکے۔ قرآن مجید میں کچھ لوگوں کا وتیرہ ذکر کیا گیا ہے: **یحرفون الکلم عن مواضعہ**'' یہ بھی وہی حرکت ہے۔

اس مضمون کا اصل مقصود وہ درد ہے، جو اس مضمون کے آخر میں ''غم امام ؓ کے ضمن میں ہمارا مجرمانہ رویہ'' کے عنوان سے بیان ہوا ہے۔ افسوس معترض نے اس عظیم مقصود سے صرف نظر کیا اور تمہید میں الجھ گئے۔ (اقرار مودت ص 21)

## مزید بات

حافظ صاحب کے اس مضمون کو دوبارہ پڑھ لیجئے۔ یہ ٹھیک ہے کہ انہوں نے اپنے عنوان میں سوگ منانے کا لفظ استعمال نہیں کیا لیکن دوسرے الفاظ میں سوگ کرنے کے مضمون کو خوب وضاحت سے بیان کیا ہے مثلاً ان کی یہ باتیں:

i- ''تو دس محرم رسول اللہ ﷺ کے غم وحزن کا دن ہے اور رسول اللہ ﷺ کا غم ہم سب کا غم ہے۔'' (امام حسین اور واقعہ کربلا ص 130)

ii- ''معلوم ہوا کہ کسی دن یا کسی رات کوئی اہم واقعہ رونما ہوا ہو تو سال بہ سال اس کی یاد سنۃ اللہ بھی ہے اور سنۃ رسول اللہ ﷺ بھی اور ایک فطری وطبعی امر بھی۔'' (اقرار مودت ص 26)

iii- ''اب دسویں محرم کو اہل بیت پر جو ظلم وستم ہوا کیا اس پر اظہار غم دس ذوالحجہ کو کیا

جائے۔ (اقرار مودت ص 29)

**ام فضل رضی اللہ عنہا کے قصہ میں بھی دسویں محرم کے دن سوگ کرنے کا ذکر نہیں ہے..... غم کی بات سن کر غمزدہ ہونا ایک فطری و طبعی عمل ہے لیکن آپ ﷺ نے اس غم کی برسی نہیں منائی۔**

ہماری اس بات پر حافظ صاحب لکھتے ہیں:

''معترض نے یہاں ایک سنگین جملہ لکھا ہے ''غم کی بات پر غمزدہ ہونا ایک فطری و طبعی عمل ہے۔'' یعنی ہمارا اس سے کوئی سروکار نہیں۔

مجھے یاد آ رہا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سفر میں تھے، ایک جگہ سواری روکی، کچھ دور گئے اور یوں بیٹھ گئے، جیسے انسان قضائے حاجت کے لیے بیٹھتا ہے، واپس آئے، فرمایا: مجھے اس وقت ضرورت نہ تھی، لیکن رسول اللہ ﷺ جب یہاں سے گزرے تھے، تو اسی مقام پر قضائے حاجت کے لیے تشریف لے گئے تھے، میرے دل نے گوارا نہ کیا کہ میں یہاں سے آپ ﷺ کے عمل کی پیروی کئے بغیر گزر جاؤں۔'' قضائے حاجت ایک فطری عمل تھا اور روزمرہ کا طبعی عمل، جس میں غم اور دکھ کا کوئی پہلو نہیں ہے۔ لیکن ابن عمر رضی اللہ عنہ نے اس میں بھی ترک اتباع گوارا نہیں کیا..... اور محدثین یہ واقعہ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہ کے اتبع للسنۃ ہونے کے سلسلے میں بیان کرتے ہیں..... لیکن یہاں معترض کہتے ہیں کہ ''حضور اکرم ﷺ کا غم ایک فطری و طبعی عمل تھا''، ہمارا اس سے کوئی تعلق نہیں۔

غور کیجئے دونوں رویوں میں وجہ فرق کیا ہے؟

وجہ فرق محبت ہے۔ وہاں محبت تھی، وہ ایسے روزمرہ کی طبعی امر میں بھی اتباع پر اکساتی تھی، یہاں باتیں ہیں، اس لیے اتباع سنت کی دعوت و تحریک کے ساتھ فہرست تیار کی ہوئی ہے کہ اس عمل کی پیروی ضروری ہے اور اس کی غیر ضروری، اتنی بات تو ضعفاء کی وجہ سے گوارا ہے، لیکن اگر کوئی فطری عمل میں پیروی کرتا ہے، تو اس پر نکیر کا کیا مطلب؟ کیا رسول اللہ ﷺ سے ہمارا تعلق

رسالت اور شفاعت تک ہے؟ خود آپ ﷺ کی ذات گرامی پر کچھ بیتے، ہمارا اس سے واسطہ نہ ہو؟

سیدنا ابن عمرؓ کا عمل سکھاتا ہے کہ فطری امور میں بھی آپ ﷺ کی پیروی تقاضائے محبت ہے۔ جو خبر سن کر رسول اللہ ﷺ رو دیے، وہ خبر سن کر اور آپ ﷺ کے رونے کا حال پڑھ کر کبھی ہماری آنکھوں سے بھی آنسو ٹپکے؟ آنسو بہنا تو کجا، یہاں تو عین وقوع شہادت کے روز تقریبات مسرت کے انعقاد کی ترغیب دی جا رہی ہے۔

حضور پرنور ﷺ کو جب اس روز خوشیاں منانے کی خبر ملتی ہوگی تو آپ ﷺ کے دل پر کیا گزرتی ہو گی؟ میں جتنا سوچتا ہوں، کانپ اٹھتا ہوں۔ ہماری جماعت کا جو حال ہو رہا ہے، کیا خبر کہ یہ آپ کی ناراضی کا اثر ہے۔ (اقرار مودت ص 22)

## ہم کہتے ہیں

ہم نے یہ الفاظ کہے تھے کہ ''غم کی بات پر غمزدہ ہونا ایک فطری وطبعی عمل ہے'' جس کا مطلب ہے کہ جو کوئی بھی غم کی بات سنتا ہے وہ فطری طور پر اپنے اندر غم محسوس کرتا ہے خواہ وہ نبی ہوں یا غیر نبی ہوں۔ جب بھی نبی ﷺ کے غم کی بات امتی سنتے ہیں تو ان کو بھی غم ہوتا ہے کیونکہ عام طور سے انسان کی فطرت اور طبع ہی ایسی ہے۔ لیکن حافظ صاحب نے ہماری اس بات کا یہ مطلب نکالا کہ نبی ﷺ کا غم آپ کا فطری وطبعی عمل تھا اس لیے ہمارا اس سے کوئی تعلق وسروکار نہیں۔ حالانکہ اس مطلب کا نہ ہم نے التزام کیا ہے اور نہ ہی یہ ہمارے کلام کو لازم ہے۔

حضرت حسینؓ کی شہادت کے بعد صحابہؓ کا دور مزید پچاس سال تک رہا پھر تابعین وتبع تابعینؒ کا دور رہا۔ جو بات حافظ صاحب یہاں ہمیں سمجھانا چاہتے ہیں اس کو صحابہ اور تابعین کے آثار سے ثابت کرتے تو ہم کیوں اعتراض کرتے۔

**3- دوسری بات یہ ہے کہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی وفات 59ھ میں ہوئی جب کہ واقعہ کربلا 61ھ میں پیش آیا (اکمال فی اسماء**

الرجال: مشکوۃ)

پھر حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے مذکورہ خواب کب اور کس تاریخ کو دیکھا یہ معلوم نہیں۔ اس کے باوجود یہ فیصلہ دینا کہ دس محرم رسول اللہ ﷺ کے غم وحزن کا دن ہے اور رسول اللہ ﷺ کا غم ہم سب کا غم ہے بے بنیاد بات ہے۔

ہماری اس بات کو حافظ صاحب یوں نقل کرتے ہیں کہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی وفات 59ھ میں ہوئی جب کہ واقعہ کربلا 61ھ میں پیش آیا (لہٰذا یہ روایت درست نہیں)۔

**تنبیہ:** بریکٹ والی عبارت حافظ صاحب کی اپنی ہے ہماری نہیں ہے۔ حافظ صاحب دسویں محرم کے دن غم کرنے کو کہتے ہیں:

ہم نے ان سے پوچھا تھا کہ جس دن یا رات کو حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے خواب دیکھا وہ دسویں محرم ہی کی تاریخ میں دیکھا اس کی کیا دلیل ہے؟

حافظ صاحب نے علامہ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ کی تقریب التہذیب سے نقل کیا کہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے سن وفات کے بارے میں دو قول ہیں 62ھ اور 61ھ اور 62ھ کا قول صحیح تر ہے۔

## ہم کہتے ہیں

اگرچہ ہم نے 59ھ کا قول اٹکل سے نہیں کیا تھا حوالہ ذکر کیا تھا پھر بھی ہم 62ھ ہی کو صحیح مان لیتے ہیں۔ اور یہ بھی مان لیتے ہیں کہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے خواب دسویں محرم کو ہی دیکھا تھا تو پھر ہمیں دیکھنا ہوگا کہ شریعت اس بارے میں کیا ہدایت دیتی ہے اور سلف صالحین یعنی صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کا اس بارے میں کیا طرز عمل رہا ہے۔ وہ حضرات تو ہمارے لیے شریعت اور محبت میں معیارِ حق ہیں

4- رسول اللہ ﷺ کو اور موقعوں پر بھی غم پیش آیا۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی شہادت، پر قراء کی شہادت پر اور اپنے صاحبزادے ابراہیم رضی اللہ عنہ کی وفات

پر لیکن آپ ﷺ نے ہر سال اس دن کو غم نہیں کیا۔ اسی طرح اگر آپ ﷺ نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت پر غم کیا تو تسلیم ہے لیکن کیا پھر آپ نے ہر دسویں محرم کو غم منایا یا اب بھی مناتے ہیں اس کی کوئی دلیل نہیں ہے۔

ہماری بات اتنی ہے کہ حافظ صاحب بتائیں کہ رسول اللہ ﷺ کو جو اور غم پیش آئے تو کیا آپ ﷺ نے ہر سال اس دن کو غم منایا لیکن حافظ صاحب بات کو اصل مطلب سے ہی پھیر دیتے ہیں۔ ان کی مندرجہ ذیل تحریر اس کی مثال ہے:

عرض: صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی بڑی تعداد مختلف معرکوں میں شہید ہوئی۔ لیکن جتنا غم آپ ﷺ کو ان مذکورہ شہادتوں پر ہوا، اتنا کبھی نہیں ہوا۔

روایت میں ہے کہ "آپ ﷺ جب احد سے واپس ہوئے تو مدینہ میں مغرب کی نماز پڑھی، اس وقت انصار اپنے شہداء پر گریہ کر رہے تھے، آپ ﷺ نے گریہ کی آواز سنی تو فرمایا: "لکن حمزة لا بواكی له" "افسوس! حمزہ کو رونے والیاں کوئی نہیں" تب انصار رضی اللہ عنہم کی عورتیں آپ ﷺ کے دروازے پر آئیں اور انہوں نے حمزہ رضی اللہ عنہ پر گریہ کیا، اس پر رسول اللہ ﷺ نے ان کے لیے دعا کی اور انہیں لوٹنے کی اجازت بخشی۔ اس دن سے یہ قاعدہ ہو گیا کہ جب انصار کے کسی گھر میں موت ہوتی تھی، تو عورتیں پہلے حمزہ رضی اللہ عنہ پر گریہ کرتی تھیں، پھر اپنی میت کو روتی تھیں۔" (طبقات ابن سعد: 44/2)

"زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کی شہادت پر آپ ﷺ ہچکیاں لے کر روئے، سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! یہ کیا ہے؟

فرمایا: "هذا شوق الحبيب الى حبيبه" (طبقات ابن سعد: 44/3)

"قراء رضی اللہ عنہم کی شہادتوں کی جب اطلاع ہوئی تو آپ کو اس قدر صدمہ ہوا کہ تمام عمر کبھی اتنا صدمہ نہیں ہوا، ایک مہینہ تک صبح کی قنوت میں ان (قاتلوں) کے حق میں بددعا فرماتے رہے۔" (سیرۃ المصطفیٰ ﷺ: 270/2)

معلوم ہوا کہ شہید سے تعلق اور شہادت کے انداز کا دل پر اثر ہوتا ہے۔

اب جتنا تعلق رسول اللہ ﷺ کو امام حسین رضی اللہ عنہ سے تھا، اتنا مذکورہ شہداء رضی اللہ عنہم میں سے کسی سے نہ تھا، اوران شہداء رضی اللہ عنہم میں سے کوئی امت کے ہاتھوں قتل نہیں ہوا، اور جو زخم اپنوں سے پہنچے، اس کا دکھ کہیں زیادہ ہوتا ہے، اس لیے امام حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کا صدمہ تمام شہادتوں سے زیادہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ کو بھی اسی خبر نے رلایا تھا کہ ''میری امت اسے قتل کرے گی۔''

خیال رہے کہ شہادتوں کا موازنہ مشہور ناصبی اعتراض ہے، جو معترض کے ہاتھ سے ''سنی'' ہونے کا شرف حاصل کر رہا ہے!

رہی ہر سال کی بات! تو حضور پرنور ﷺ ہر سال حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے اصحاب کی نجات اور فرعون کی ہلاکت کی یاد میں روزہ رکھتے تھے اور فرماتے تھے: ''نحن احق و اولی بموسی منکم''. (متفق علیہ، مشکوٰۃ: 180)
یعنی ''موسیٰ علیہ السلام ہمارے ہیں، تم (یہود) سے زیادہ ہمارا ان سے تعلق ہے۔''

خود ہماری تاریخ میں قرآن مجید کا نزول جہانوں کے لیے رحمت عظمیٰ اور نعمت کبریٰ ہے، قرآن مجید جس رات نازل ہوا، اللہ تعالیٰ نے اسے لیلۃ القدر قرار دیا، وہ خاص رات تو گزر گئی، لیکن اب سال بہ سال جب بھی وہ رات آتی ہے، اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت اور برکت لے کر آتی ہے، مقصود کیا ہے؟ تا کہ اس نعمت سے تعلق تازہ رہے اور اس کی قدر کی جائے۔ اہل اسلام ہر سال اس رات کی قدر میں مشغول عبادت و تلاوت ہوتے ہیں۔ یہ یاد خود اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمائی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ کسی دن یا کسی رات کوئی اہم واقعہ رونما ہوا ہو، تو سال بہ سال اس کی یاد سنۃ اللہ بھی ہے اور سنۃ رسول اللہ ﷺ بھی، اور ایک فطری و طبعی امر بھی۔

ہماری تاریخ میں امام حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت سے زیادہ دردناک سانحہ کوئی نہیں، اور یہ شہادت ایک عظیم مقصد کے لیے ہوئی، تو جس تاریخ کو یہ واقعہ رونما ہوا، اس تاریخ کو اس کی یاد آ جائے، دل دکھ سے بھر جائے، آنکھیں آنسوؤں

سے لبریز ہو جائیں اور رسول اللہ ﷺ کی پیروی میں دسویں محرم کو ہم کہیں: ''نحن احق و أولى بالحسين منكم'' تو اس پر اعتراض کیوں؟ (اقرار مدت ص 24 تا 26)

## ہم کہتے ہیں

حافظ صاحب نے ہر سال کی شب قدر اور عاشورہ کے روزے کا ذکر کیا ہے لیکن ان کے بارے میں تو نص موجود ہے جب کہ زیر بحث مسئلہ میں کوئی نص موجود نہیں محض حافظ صاحب کا قیاس ہے۔ پھر اس میں بھی ان کا معیار انوکھا ہے اور وہ یہ کہ جو غم سب سے زیادہ دردناک ہو اس کو سال بہ سال منایا جائے باقی دردناک غموں کو چھوڑ دیا جائے۔

5- ائمہ مجتہدین اور اہل اللہ اور محدثین نے کہیں اس کی تصریح نہیں کی کہ دسویں محرم کو شادی کرنا یا تقریب مسرت منانا نہایت درجہ بدذوقی اور سنگدلی ہے۔

اس کا حافظ صاحب نے عجیب جواب دیا ہے لکھتے ہیں:

''ان مجتہدین اور محدثین کو کیا پتا تھا کہ ایسے بے حس اور بے درد لوگ بھی اس امت میں پیدا ہوں گے جو ایسے فطری امور پر تصریحات طلب کریں گے۔''

6- مصنف نے حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ کی یہ بات نقل فرمائی کہ ہمارے غم میں جس کی آنکھیں نمناک ہوئیں یا اس کی آنکھوں سے کوئی آنسو ٹپک پڑا تو اللہ عزوجل اسے جنت عطا فرمائے گا۔ اس روایت میں بھی دسویں محرم کو غم کا دن منانے کا سرے سے کچھ ذکر نہیں ہے۔

ہماری اس بات پر حافظ صاحب لکھتے ہیں:

اب دسویں محرم کو اہل بیت پر جو ظلم و ستم ہوا، کیا اس پر اظہار غم دس ذوالحجہ کو

کیا جائے۔

یاد رہے کہ دس محرم کی تخصیص شرعی تخصیص نہیں فطری تخصیص ہے اور شریعت نے انسانی فطرت کا لحاظ رکھا ہے۔(اقرار مودت ص:29)

حافظ صاحب کی یہ مذکورہ تقسیم بذات خود تعجب خیز ہے کیونکہ شریعت جن فطری امور کی رعایت کرتی ہے ان کو خود اپنے احاطہ میں لے کر ان کو بھی شرعی بنا دیتی ہے۔

حافظ صاحب کی اس بات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت سنت و بدعت کے اصول ان کے ذہن میں نہیں رہے مزید بریں حافظ صاحب نے یہ نکتہ عجیب نکالا ہے:

"ویسے بھی حضور پر نور ﷺ اس وقت جس جہاں میں ہیں (وہاں ایک دن ہمارے ایک ہزار سال کے برابر کا ہوتا ہے اس لیے......عبدالواحد) وہاں ابھی شہادت حسین رضی اللہ عنہ کا دوسرا دن ہے، اور تین دن سوگ مسنون ہے تو حضور ﷺ تو ابھی سوگ میں ہیں۔" (اقرار مودت ص 28)

اور لیجئے یہاں تو حافظ صاحب نے خود بھی سوگ کا لفظ استعمال کیا ہے پھر ہم پر اعتراض کیوں ہے؟

7- مصنف نے دس محرم کے دن میں تقریب مسرت کے منعقد کرنے کو 22 رجب کو کونڈے بھرنے کی طرح بتایا ہے۔ حالانکہ دونوں میں بہت فرق ہے۔ جو لوگ (یعنی شیعہ) حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے یوم وفات 22 رجب کو کونڈے بھرتے ہیں وہ اس دن میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات کی خوشی میں ایسا کرتے ہیں جب کہ اہلسنت اگر دس محرم کو کوئی نکاح، ولیمہ یا اور کوئی تقریب مسرت کرتے ہیں تو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی وفات کی خوشی میں ایسا نہیں کرتے بلکہ شریعت کی طرف سے اباحت کو دیکھتے ہوئے ایسا کرتے ہیں۔

ہماری اس بات پر حافظ صاحب لکھتے ہیں:

کتاب مذکور (یعنی امام حسینؓ اور واقعہ کربلا) میں استدلال یہ ہے کہ 22 رجب کو جو لوگ کونڈے بھرتے ہیں وہ امام جعفر صادقؒ کے ایصال ثواب کے لیے بھرتے ہیں۔ آپ کہتے ہیں کہ 22 رجب حضرت معاویہؓ کا یوم وفات ہے، وہ ان کی وفات کی خوشی میں ایسا کرتے ہیں.........عرض یہ ہے کہ آپ کو کیا حق ہے کہ دوسروں کی نیت پر حملہ کریں۔ اور امام جعفر صادق کو ایصال ثواب اس دن بھی ہو سکتا ہے جس دن حضرت معاویہؓ کی وفات ہوئی۔ کسی مجتہد اور کسی فقیہ اور محدث نے اسے ممنوع نہیں لکھا، علی الخصوص آپ کی فکر کے مطابق تو اسے بالکل درست ہونا چاہئے کہ 22 رجب امام جعفر کا یوم ولادت ہے نہ ہی یوم وفات!

لیکن اگر آپ کو اصرار ہے کہ کچھ لوگوں نے یہ کہا ہے کہ 22 رجب کو ایصال ثواب کے پردے میں حضرت معاویہؓ کی وفات کی خوشی منائی جاتی ہے اس لیے اس روز اس امر مباح کو ترک کیا جائے گا تو بالکل یونہی دسویں محرم کو خوشی شمر لعین نے منائی، لشکر یزید نے منائی، یزیدی عمال نے جشن فتح منایا، جلوس نکالا.........اور اب بھی ان دنوں میں نواصب کی باچھیں کھلی ہوتی ہیں اور وہ منہ بھر بھر کر خروج علی الامام کی سزا میں وارد احادیث پڑھ رہے ہوتے ہیں۔ صاف دل اہل سنت کی نیت تقریب مسرت کے انعقاد میں اگرچہ بری نہیں ہوتی لیکن ان بدبختوں کی مشابہت اور فتنے سے بچنے کے لیے انہیں اس دن اس امر مباح کو ترک کرنا چاہئے۔ (اقرار مودت ص 30)

## ہم کہتے ہیں

حافظ صاحب کے پیش نظر یہ بات نہیں رہی کہ ایصال ثواب کے لیے دن کی تعیین شرعاً درست نہیں۔ پھر اگر ناصبی دس محرم کو حضرت حسینؓ کی شہادت پر خوشی منانے کے لیے تقریبات منعقد کرنے لگیں اور اس کو اپنا شعار بنالیں تو ان سے تشبہ سے بچنے کے لیے اہل سنت کو اس دن ایسی جگہوں پر جہاں ناصبی بستے ہوں تقریب مسرت منانے سے پرہیز کرنا ہوگا۔ لیکن جب تک صورتحال ایسی نہ ہو تو اباحت پر عمل کس وجہ سے جائز نہ ہو؟

<u>پانچواں اعتراض</u>

# دسویں محرم یعنی دن کی قید کے ساتھ شہدائے کربلا کو ایصال ثواب

مصنف نے شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا رحمہ اللہ کے بارے میں یہ قصہ نقل کیا ہے جو ان کے خلیفہ مجاز مولانا عزیز الرحمٰن نے اپنی کتاب اکابر کا مسلک ومشرب میں ذکر کیا ہے:

ایک دفعہ مدینہ منورہ میں خدام نے عاشورہ کا روزہ رکھا۔ عصر کے بعد افطاری اور کھانے کے اہتمام میں مشغول تھے تو حضرت نے ہمیں بلا کر پوچھا:

آج شہداء کربلا اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے لیے کیا کیا ایصال ثواب کیا؟

خاموشی پر حضرت نے فرمایا:

ڈوب مرو، تم سے تو وہ (خبیث رافضی) ہی اچھے جو کم از کم جھوٹ موٹ رو تو لیتے ہیں۔

پھر حضرت نے خود ایصال ثواب کیا اور اس کی بڑی مقدار تعلیم کی خاطر اظہار فرمائی۔ (امام حسینؓ اور واقعہ کربلا ص 258)

هم کہتے ہیں:

1- عزیز الرحمٰن صاحب اپنی اس کتاب سے رجوع کر چکے ہیں اگرچہ ہمیں اس کا انداز تسلی بخش معلوم نہیں ہوتا۔

2- ہم نے خود شیخ الحدیث رحمہ اللہ کے صاحبزادے مولانا طلحہ صاحب اور نواسے مولانا شاہد سہارنپوری صاحب سے اس کی تصدیق چاہی تو انہوں نے اس واقعہ کو تسلیم نہیں کیا۔

3- ایصال ثواب ایک نفلی کام ہے واجب نہیں ہے۔ اس کے نہ کرنے پر سخت نکیر کرنا اور یوں کہنا کہ ڈوب مرو اور تم سے تو (خبیث رافضی) ہی اچھے ہیں اصول دین کے بالکل مخالف بات ہے جو حضرت شیخ الحدیث رحمہ اللہ کبھی نہیں کہہ سکتے۔

غرض یہ قصہ تو محض جھوٹ ہے جو شیخ الحدیث رحمہ اللہ کے نام لیواؤں نے کچھ اور جھوٹ سمیت ان کو بدعتی ثابت کرنے کے لیے گھڑا تھا۔

ہمارے آخری جملے پر حافظ صاحب لکھتے ہیں:

''نام لیواؤں سے معترض کی مراد غالباً خلفاء ہیں، جن کے عبرت ناک انجام کے بارے میں بھی وہ ایک رسالہ شائع کر چکے ہیں، اگرچہ عبرت ناک انجام معترض کے اپنے وہم وخیال میں ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے کہ کس کا انجام کیا ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کا انجام ایمان اور عمل صالح پر فرمائے!

جن حضرات کی طرف جھوٹ گھڑنے اور شیخ کو بدعتی بنانے کی نسبت کی گئی

ہے، یہ شیخ الحدیثؒ کے خلفاء ہیں، خلافت شیخ کی طرف سے درستی حال کی تصدیق اور خلیفہ کے قول وفعل پر اعتماد کی علامت ہوتی ہے۔

معترض نے جن باتوں کا ذکر کیا ہے یہ وہ کبائر ہیں، جنہیں ایک عام مومن بھی برا جانتا ہے اور انہیں باعث عیب گردانتا ہے، کجا یہ کہ ایک خلیفہ نہیں، کئی خلفاء مل کر یہ کام کرتے ہوں۔ بات لکھتے ہوئے کچھ تو خوف خدا چاہیے، سوچیے اس کی زد کس پر پڑتی ہے؟

پھر عرض ہے کہ اختلاف رائے اور اختلاف عمل ہوتا رہتا ہے، لیکن اس بنا پر دشنام والزام علماء کو زیب نہیں دیتا۔" (اقرار مودت ص 36)

## ہم کہتے ہیں

مولانا زکریا رحمہ اللہ کے مذکورہ قصہ سے متعلق حافظ صاحب نے "اقرار مودت" میں بہت سی صفائیاں پیش کی ہیں۔ ہم نے مولانا زکریا رحمہ اللہ کے دفاع میں ان کے چار خلفاء کا ذکر اپنے کتابچہ میں کیا جس کا نام داستان عبرت ہے۔ عبرتناک انجام نہیں ہے۔ ان چار خلفاء یعنی جناب صوفی اقبال صاحب، عزیز الرحمٰن صاحب ہزاروی، عبدالحفیظ مکی صاحب اور حافظ صغیر احمد صاحب نے اپنے شیخ کی طرف جو کچھ منسوب کیا ہے وہ جھوٹ کے سوا کچھ نہیں۔ ہم حافظ صاحب سے گزارش کرتے ہیں کہ وہ ہمارے رسالہ داستان عبرت کا مطالعہ فرمائیں اور انصاف سے فیصلہ کریں اور عزیز الرحمٰن ہزاروی صاحب کو بھی یہ بتا کر کہ "رجوع رائے سے تو ہوتا ہے کیا واقعہ سے بھی رجوع ہو سکتا ہے؟" ان سے پوچھیں کہ انہوں نے اپنی جن تحریروں سے رجوع کیا ہے، اس کی کیا حقیقت ہے؟ اور رجوع کرنے کی وجہ کیا ہے؟

پھر حافظ صاحب کو یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ خلافت کو شیخ کی طرف سے خلیفہ کے قول و فعل پر اعتماد کو علامت کو تسلیم بھی کیا جائے تو وہ خلافت دینے کے وقت کی بات ہوتی ہے آئندہ کے لیے محض حسن ظن ہوتا ہے۔ خلافت آئندہ کے لیے معصومیت یا حفاظت کی سند نہیں ہوتی۔

چھٹا اعتراض:

# حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو ذبح عظیم قرار دینا

مصنف لکھتے ہیں:

قرآن مجید میں بھی ایک ذبح عظیم مذکور ہے جس کا مصداق و معنی ابو الکلام اور اقبال جیسے قران شناسون نے حسین رضی اللہ عنہ قرار دیا ہے۔ (ص 141)

هم کہتے ہیں

اول تو ابوالکلام اور اقبال جیسے حضرات یہ منصب نہیں رکھتے کہ قرآن پاک کے الفاظ کی تفسیر کر سکیں اور اگر اس کو تاویل واعتبار کا نکتہ بھی مان لیں تو یہ مضمون سے کچھ مطابقت نہیں رکھتا کیونکہ ذبح عظیم یعنی جنت سے آیا ہوا مینڈھا ایک بہت بڑی نعمت اور خوشی کی چیز تھی جو ایک بڑی آزمائش میں پورا اترنے پر ملی۔ اس کے برعکس حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور ان کے رفقاء کی مظلومانہ شہادت تو خود بڑی آزمائش تھی جس پر رسول اللہ ﷺ انتہائی غمزدہ ہوئے۔ غم کی چیز کو خوشی کی چیز پر قیاس واعتبار کرنا درست بات نہیں ہے۔

ہماری اس تنبیہ پر حافظ صاحب نے اپنی بات میں تبدیلی کرنے کو قبول کیا اور لکھا:

''اس تفصیل سے واضح ہو گیا کہ کتاب میں درج جملے میں سہو ہوا ہے۔ یہ

جملہ یوں ہونا چاہئے:

قرآن مجید میں گزشتہ امت کا ایک ذبح عظیم مذکور ہے۔ ابوالکلام اور اقبال کے اشارات کی روشنی میں ہماری امت کے ذبح عظیم حسین ہیں جو فرات کنارے اللہ کی راہ میں ذبح ہوئے۔'' (اقرار موزت ص 38)

## ہم کہتے ہیں

حافظ صاحب کی جانب سے یہ تبدیلی اب بھی اصلاح طلب ہے۔ جس پر مزید کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں بلکہ جو نکتہ ہم نے پہلے لکھا وہی کافی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ذبح عظیم اور چیز ہے اور ذبیح اور چیز ہے۔

## ساتواں اعتراض:

# قاضی شریح رحمہ اللہ کی بے احترامی

قاضی شریح رحمہ اللہ حضرت عمرؓ کے مقرر کیے ہوئے قاضی تھے اور اکابر صحابہ ان کے فیصلوں پر اعتماد کرتے تھے۔ لیکن مصنف نے شاید تاریخی روایات پر غیر ضروری اعتماد کر کے ان کی شخصیت کو مجروح کیا اور لکھا:

i- ''قاضی شریح بھی اس وقت ابن زیاد کے پاس موجود تھا۔ ابن زیاد کی نظر جو ہانی پر پڑی تو اس نے شریح سے کہا: اس احمق کو اس کی قضا ہمارے پاس کھینچ لائی ہے''۔ (امام حسینؓ اور واقعہ کربلا ص 38)

ii- ابن زیاد نے قاضی شریح سے کہا تم ان لوگوں کے پاس جاؤ اور انہیں بتاؤ کہ میں نے محض تحقیقات کی غرض سے انہیں روک رکھا ہے۔ اور ایک غلام کو قاضی پر جاسوس مقرر کر دیا۔ شریح ہانی کے قریب سے گزرا تو ہانی نے اسے کہا شریح! خدا سے ڈرو، یہ مجھے قتل کرنے کے درپے ہے۔

شریح باہر نکلا، محل کے دروازے پر کھڑا ہوا اور لوگوں سے کہا ہانی کو کوئی خطرہ نہیں ہے، امیر نے محض تحقیقات کی خاطر انہیں روک لیا ہے۔ یہ سن کر لوگ منتشر ہو گئے۔ (امام حسینؓ اور واقعہ کربلا ص 40)

قاضی شریح رحمہ اللہ کے بارے میں ہم نے توجہ دلائی تو حافظ صاحب لکھتے ہیں:

نقیر نے تو تاریخی روایات پر غیر ضروری اعتماد کیا۔ کیا معترض کسی قابل اعتماد روایت سے بتائیں گے کہ واقعہ کربلا میں جس طرح دین کو پامال کیا گیا، آل رسول ﷺ پر وحشیانہ مظالم کئے گئے، قاضی صاحب نے اس پر کوئی احتجاج کیا استعفیٰ دیا؟

ہمارے دور میں ایسا کوئی واقعہ ہو جائے تو چیف جسٹس افتخار چودھری از خود نوٹس لیتے ہیں، اور یہ عین اسلامی روایت ہے، کیا قاضی شریح نے اتنے بھیانک جرائم کا کوئی نوٹس لیا؟

منصب قضا بلکہ کسی بھی منصب کے بارے میں یہ نہیں دیکھا جائے گا کہ اسے مقرر کس نے کیا؟ دیکھا یہ جائے گا کہ اس نے کام کیسا کیا؟ اپنے منصب کی لاج رکھی یا نہیں؟ ابتدا کو نہیں، انتہا کو دیکھا جاتا ہے۔ حدیث ہے: "إنما العبرة بالخواتيم". (اقرار مودت ص 39)

## ہم کہتے ہیں:

قاضی شریح رحمہ اللہ نے حضرت حسین ﷺ اور دیگر اہل بیت کی مظلومانہ شہادت پر کوئی احتجاج کیا تھا یا نہیں اس سے جب تاریخ خاموش ہے تو ہم اتنی صدیوں بعد کیا کہہ سکتے ہیں۔ البتہ یہ معلوم ہے کہ انہوں نے استعفیٰ نہیں دیا تھا۔ لیکن کیا استعفیٰ دینا لازمی تھا؟ اگر سب ہی اچھے اور ماہر قاضی استعفیٰ دے دیتے تو عہدہ نا اہل ہاتھوں میں چلا جاتا۔ قضا تو دین کا کام تھا عہدے کا مسئلہ تھوڑا تھا اور کیا اس وقت کے اور بعد کے اہلبیت نے قاضی شریح رحمہ اللہ کے بارے میں کوئی تنقیدی یا تحقیری تبصرے کئے۔ جب انہوں نے ایسا نہیں کیا تو چودہ صدیوں کے بعد اب کسی کو کیا حق ہے کہ وہ قاضی رحمہ اللہ پر الزام تراشی کرے۔ شیعوں کے ستون ملا باقر مجلسی اپنی کتاب میں اس قصہ کو ذکر کرتے ہیں تو اس پر تعجب نہیں لیکن کوئی اہل سنت اس غیر تحقیقی واقعہ کو ذکر کرے تو اس پر تعجب اور افسوس ضرور ہوتا ہے۔

ذیل میں ہم جامعہ مدنیہ لاہور کے فاضل مولانا عبدالحفیظ صاحب مدظلہ العالی کا قاضی شریح رحمہ اللہ کے بارے میں ایک فاضلانہ مضمون کچھ غیر متعلقہ حذف کے ساتھ نقل کرتے ہیں جو 1995ء کے ایک سہ ماہی منہاج میں شائع ہوا تھا۔ اس سے بھی بہت سے عقدے حل ہوں گے۔

# حضرت قاضی شریح رحمۃ اللہ علیہ

27 مئی 1995ء کے نوائے وقت کا مطالعہ کر رہا تھا کہ آخری صفحہ کی ایک خبر پر نظریں آ کر رک گئیں۔ خبر کا عنوان تھا "لعنت بر قاضی شریح کانفرنس 29 مئی کو ہونے والی کانفرنس میں شرکت کا دعوت نامہ چیف جسٹس کو بھیج دیا گیا۔" اس عنوان کے تحت تفصیل یوں درج تھی:

"مسلم لیگ لاہور کے جنرل سیکرٹری پرویز رشید نے چیف جسٹس پنجاب ہائی کورٹ محمد الیاس کو "لعنت بر قاضی شریح" کانفرنس میں صدارت کے لیے دعوت دی ہے۔ ان کے نام لکھے جانے والے ایک مکتوب میں کہا گیا ہے کہ تاریخ انسانی کے سیاہ کرداروں میں سے قاضی شریح کے قابل نفریں کردار سے کون واقف نہ ہوگا جس نے یزید سے اشرفیوں بھری تھیلی قبول کر کے محافظ جنت حضرت امام حسین ؓ کے فتوے قتل پر مہر ثبت کر دی۔ کانفرنس 29 مئی کو منعقد ہوگی۔"

(روزنامہ نوائے وقت لاہور 27 مئی 95ء صفحہ آخر کالم 2,1)

یہ خبر پڑھ کر کہ عظیم محدث، جلیل القدر تابعی، عالم اسلام کے مایہ ناز قاضی جن کے علم و فضل، زہد و تقویٰ، ذکاوت و ذہانت، تدبر و فراست، عدل و انصاف پر امیر المؤمنین سیدنا فاروق اعظم ؓ جیسا شخص اعتماد کرتے ہوئے انہیں منصب قضا پر فائز فرمائے اور سیدنا علی المرتضیٰ ؓ جیسا مدبر ان کی فقاہت پر اعتماد کرتے ہوئے ان کو عہدۂ قضا پر بحال رکھے ایسے برگزیدہ شخص پر ہمارے معاشرے میں علانیہ لعنت کی جا رہی ہے اور انہیں تاریخ کے سیاہ کرداروں میں شمار کیا جا رہا ہے، بڑی حیرت ہوئی اور ساتھ ہی افسوس

بھی ہوا کہ ایک ایسی شخصیت جس کی پوری زندگی ملت اسلامیہ کے لیے مشعل راہ اور مینارۂ نور ہو جس نے اپنے عہدہ قضا کے دوران ہمیشہ مظلوموں کا ساتھ دیا ہو۔ اہل حق کو ان کا حق دلوایا ہو، خواہ فریق مخالف وقت کا حاکم ہی کیوں نہ ہو یا اپنے قریبی رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں، اس کے بارے میں ایسی کانفرنس کی جا رہی ہے اور وہ بھی مسلمانوں کے ملک میں۔ قاضی شریح کی شخصیت تو ایسی غیر متنازع شخصیت ہے کہ ان پر اہل سنت اور اہل تشیع دونوں کا اتفاق ہے، پھر ایسی کانفرنس کا ہونا ایک المیہ سے کم نہیں۔

اس لیے احقر نے ضروری خیال کیا کہ قاضی شریح رحمہ اللہ کے کچھ حالات لکھے جائیں تا کہ عام مسلمانوں کو اصل صورت حال کا علم ہو اور وہ دشمنان اسلام کے مکروہ پروپیگنڈہ سے محفوظ رہ سکیں۔

## نام ونسب

آپ کا نام شریح اور کنیت ابو امیہ ہے۔

(تہذیب الاسماء واللغات ج اول ص 243)

آپ عہد رسالت ہی میں ایمان کی دولت سے مشرف ہو چکے تھے، مگر شرف صحابیت سے مشرف نہیں ہو سکے۔ بعض مؤرخین نے آپ کی صحابیت کو بھی تسلیم کیا ہے، لیکن صحیح قول یہی ہے کہ آپ کو عہد رسالت میں ایمان لانے کے باوجود نبی کریم ﷺ سے ملاقات کا شرف حاصل نہیں ہو سکا۔ علامہ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے اسی قول کو راجح قرار دیا ہے۔ (الاصابہ ج 3 ص 202)

تمام مؤرخین کا اس پر اتفاق ہے کہ آپ کا شمار جلیل القدر تابعین میں ہوتا ہے اور آپ تاریخ اسلام کے قابل فخر قاضیوں میں سے ہیں۔

آپ یمن کے رہنے والے تھے۔ بعض مؤرخین کا یہ قول بھی ہے کہ آپ اصلاً عجمی ہیں، بعد ازاں آپ کا قبیلہ یمن میں آ کر آباد ہو گیا۔ سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں آپ یمن سے مدینہ منورہ آ کر آباد ہوئے۔ (سیر اعلام النبلاء ج 4 ص 100)

## علم وفضل

قاضی شریح رحمہ اللہ نے تمام اکابر صحابہ خصوصاً خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کا زمانہ پایا تھا۔ ان کی علمی مجالس سے خوشہ چینی اور استفادہ کیا تھا۔ آپ انتہائی ذکی و ذہین، طباع اور فطری صلاحیتوں کے مالک تھے۔

امام نوویؒ نے لکھا ہے:

**"واتفقوا علی توثیق شریح و دینہ و فضلہ والا حتجاج بروایتہ وذکائہ و انہ اعلمھم بالقضا." (تھذیب الاسماء واللغات ج 1 ص 244)**

شریح کی توثیق، دینداری، فضل وکمال، ذکاوت اور ان کی روایت سے احتجاج پر سب کا اتفاق ہے اور اس پر بھی اتفاق ہے کہ آپ اپنے اہل زمانہ میں قضا کو سب سے زیادہ جاننے والے تھے۔

علامہ ابن حجر عسقلانیؒ نے "تہذیب التہذیب" میں اور امام ذہبیؒ نے "سیر اعلام النبلاء" میں اور حافظ یوسف مزیؒ نے "تہذیب الکمال فی اسماء الرجال میں امام الجرح و التعدیل یحییٰ بن معین کے حوالے سے آپ کو ثقہ لکھا ہے۔ (تہذیب التہذیب ج 4 ص 326، سیر اعلام النبلاء ج 4 ص 101، تہذیب الکمال فی اسماء الرجال ج 12 ص 438)

آپ حافظ الحدیث ہونے کے ساتھ ساتھ کوفہ کے کبار فقہاء میں شمار کئے جاتے تھے۔ فن تعبیر کے امام علامہ ابن سیرینؒ کا قول ہے:

**"سرج اھل الکوفۃ اربعۃ عبیدۃ السلمانی و الحارث الاعور، و علقمۃ بن قیس و شریح. (تھذیب الکمال ج 12 ص 439)**

اہل کوفہ کے چراغ (مایہ ناز شخصیات) چار ہیں۔ عبیدۃ السلمانی، حارث اعور، علقمۃ بن قیس اور قاضی شریح۔

آپ کے علم وفضل، نکتہ رسی اور باریک بینی، دوراندیشی کی شہرت ایسی تھی کہ آپ کی عدالت میں بڑے بڑے علماء آپ کے فیصلے سننے کے لیے حاضر ہوا کرتے تھے۔ چنانچہ مکحولؒ تابعی فرماتے ہیں کہ میں چھ ماہ تک قاضی شریح کی عدالت میں صرف ان کے فیصلے

سننے کے لیے حاضر ہوتا رہا۔ (طبقات ابن سعد ج 6 ص 139)

## روایت حدیث

قاضی شریح نبی کریم ﷺ سے مرسلاً حدیث روایت کرتے ہیں۔ صحابہ میں سے حضرت زید بن ثابت، عبداللہ بن مسعود، عبدالرحمٰن بن ابی بکر الصدیق، عروۃ البارقی، حضرت علی بن ابی طالب اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہم سے احادیث روایت کرتے ہیں۔

آپ کے شاگردوں میں حضرت ابراہیم نخعی، امام شعبی، قیس بن ابی حازم، محمد بن سیرین رحمہم اللہ اور بہت سے اکابر محدثین شامل ہیں۔ (تہذیب الکمال ج 12 ص 437،436)

آپ صحابی رسول اور یمن کے گورنر حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کے خصوصی شاگرد تھے۔ (تہذیب الکمال ج 12 ص 438)

## عہدۂ قضا پر تقرری

خلفیہ دوم سیدنا فاروق اعظم ؓ کے زمانے میں ایک واقعہ پیش آیا تھا جس کی بناء پر فاروق اعظم ؓ نے آپ کی قابلیت اور ذاتی جوہر کو دیکھتے ہوئے آپ کو کوفہ کا قاضی مقرر کر دیا تھا۔ آپ نے اس شان سے اس ذمہ داری کو نبھایا کہ سبحان اللہ! مسلسل ساٹھ برس تک قاضی کے فرائض سر انجام دیتے رہے۔ اس طویل مدت میں بڑے بڑے انقلابات و حوادث پیش آئے۔ خلافت راشدہ کا دور ختم ہو کر اموی دور حکومت کا آغاز ہوا، مگر اس تمام عرصہ میں کسی شخص کو بھی آپ کے کسی فیصلہ پر انگشت نمائی کا موقعہ نہیں ملا۔ حضرت عمر ؓ کے بعد حضرت عثمان ؓ نے بھی آپ کو اس عہدہ پر بحال رکھا۔ پھر جب حضرت علی کرم اللہ وجہہ، کا دور آیا تو آپ نے قاضی شریح کو "اَقْضَی الْعَرَبِ (عرب کا سب سے بڑا قاضی) کا خطاب دیا اور آپ کی تنخواہ سو درہم سے بڑھا کر پانچ سو درہم کر دی۔ (طبقات ابن سعد ج 6 ص 138) یہاں تک کہ حجاج کے زمانے میں آپ نے کبر سنی، علالت اور ضعف و پیری کی وجہ سے خود ہی استعفاء دیا اور استعفے کے ایک سال

بعد آپ کا انتقال ہوا۔

قاضی شریح چونکہ تاریخ اسلام میں بحیثیت قاضی ہی زیادہ مشہور ہیں اور ان کی ذات پر اعتراض بھی اسی حیثیت سے کیا گیا ہے۔ اس لیے ہم ان کی قضاء کی زندگی کے چند حالات و واقعات درج کرتے ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ وہ قضا کے معاملہ میں اسلاف کی تعلیمات کے کس قدر پابند تھے۔ امیر و غریب، چھوٹا بڑا، حاکم اور محکوم ان کی نظر میں سب یکساں تھے۔

## فاروق اعظم رضی اللہ عنہ قاضی شریح کی عدالت میں

ایک بار حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک شخص سے اس شرط پر گھوڑے کا سودا کیا کہ اگر مجھ کو پسند آ گیا تو میں رکھ لوں گا، ورنہ واپس کر دوں گا۔ آپ نے امتحان کے لیے ایک دوسرے شخص کو دیا، اتفاق سے وہ گھوڑا زخمی ہو گیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مالک کو وہ گھوڑا واپس کرنا چاہا تو مالک نے واپس لینے سے انکار کر دیا۔ آپس میں بات بڑھی تو کسی تیسرے کو حکم بنانے کا فیصلہ ہوا۔ مالک نے قاضی شریح کا نام پیش کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قبول کر لیا۔ قاضی شریح نے فیصلہ یہ دیا کہ "امیر المومنین جیسا گھوڑا آپ نے لیا تھا ویسا ہی واپس کریں، ورنہ پھر اپنے پاس رکھیں۔" حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے خلاف فیصلہ سننے کے بعد دوبارہ سوال کیا، کیا تمہارا یہی فیصلہ ہے؟ اس پر قاضی شریح نے کہا بالکل۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خوش ہو کر فرمایا، جاؤ آج سے تمہیں کوفہ کا قاضی مقرر کیا جاتا ہے۔ (طبقات ابن سعد ص 132 ج 6)

## حضرت علی رضی اللہ عنہ قاضی شریح کی عدالت میں

ایک قاضی کا سب سے بڑا وصف اور سب سے مقدم فرض یہ ہے کہ وہ فیصلہ کرنے میں کسی خارجی اور داخلی اثر سے متاثر نہ ہو اور کسی حالت میں بھی اس کے ہاتھ سے حق و انصاف کا دامن نہ چھوٹنے پائے۔ قاضی شریح میں یہ وصف اس حد تک تھا کہ قانون اور حق و انصاف کے مقابلہ میں بڑی سے بڑی شخصیت اور بڑے سے بڑے تعلق کی پرواہ نہ کرتے تھے۔ ایک معمولی شخص کے مقابلہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے خلاف فیصلہ دینے کا

واقعہ اوپر گزر چکا ہے۔ اب ایک اور واقعہ بھی پڑھ لیجئے۔ واقعہ یہ ہے کہ حضرت علی ﷛ ایک سفر سے واپس آ رہے تھے۔ راستہ میں آپ کی زرہ گر گئی اور کسی یہودی کے ہاتھ لگ گئی۔ حضرت علی ﷛ کو جب علم ہوا تو آپ نے قاضی شریح کی عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا۔ قاضی شریح نے یہودی کو عدالت میں طلب کر لیا اور اس سے پوچھا کہ تم کیا کہتے ہو۔ اس نے جواب دیا کہ یہ زرہ میری ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ میرے قبضہ میں ہے۔ حضرت علی ﷛ کو قاضی شریح نے گواہ پیش کرنے کو کہا۔ حضرت علی ﷛ نے اپنے صاحبزادہ حضرت حسن ﷛ اور اپنے غلام قنبر کو پیش کیا۔ اس پر قاضی شریح نے کہا کہ قنبر کی شہادت تو میں قبول کرتا ہوں، لیکن تمہارے بیٹے کی شہادت تمہارے حق میں قبول نہیں کرتا۔ دوسرا کوئی گواہ ہو تو پیش کریں۔ حضرت علی ﷛ نے فرمایا حضور ﷺ نے حسن ﷛ کو نوجوانان جنت کا سردار فرمایا ہے کیا تم ان کی بھی شہادت قبول نہیں کرتے۔ قاضی شریح نے جواب دیا کہ میں باپ کے حق میں بیٹے کی شہادت قبول نہیں کیا کرتا، لہٰذا گواہ نہ ہونے کی وجہ سے فیصلہ یہودی کے حق میں کرتا ہوں۔ حضرت علی ﷛ نے یہ فیصلہ برضا و رغبت قبول کر لیا اور زرہ یہودی ہی کے پاس رہنے دی۔ قاضی شریح کے اس فیصلے نے یہودی پر اتنا اثر کیا کہ اس کے قلب کی دنیا ہی بدل گئی۔ اس کا قلب نور ایمان سے منور ہو گیا اور اس نے اقرار کیا کہ زرہ آپ ہی کی ہے اور اسلام ایک سچا مذہب ہے کہ مسلمانوں کا قاضی امیر المؤمنین کے خلاف فیصلہ کرتا ہے اور امیر المؤمنین بلا چون و چرا دل و جان سے اسے تسلیم کرتے ہیں اور عدالت ہی میں کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو گیا اور حضرت علی ﷛ نے اس کے اسلام پر خوش ہو کر وہ زرہ اسے ہبہ کر دی۔ (شذرات الذہب ج 1 ص 85)

## حقیقی بیٹا عدالت کے کٹہرے میں

قاضی شریح تاریخ اسلام کے ان مایہ ناز قاضیوں میں سے ہیں جن کے فیصلوں پر مسلمان ہمیشہ فخر کرتے رہیں گے کہ انہوں نے عدل و انصاف کے معاملہ میں خود اپنے رشتہ داروں کو کسی رعایت کا مستحق نہیں سمجھا عدل گستری وہ اپنا مذہبی فریضہ سمجھتے تھے۔

چنانچہ ایک بار ان کے ایک بیٹے اور دیگر چند حضرات کے مابین کسی حق کے بارے میں کچھ تنازعہ تھا۔ بیٹے نے عدالت میں مقدمہ دائر کرنے سے قبل اپنے والد گرامی کے سامنے مقدمہ کی تمام نوعیت رکھی اور والد صاحب سے مشورہ طلب کیا۔ اگر اس صورت میں میرا حق بنتا ہو اور مقدمہ میں کامیابی کی صورت بنتی ہو تو میں آپ کی عدالت میں مقدمہ کرتا ہوں، ورنہ بصورت دیگر خاموش رہوں گا۔ قاضی شریح نے مقدمہ کی نوعیت پر غور کر کے مقدمہ دائر کرنے کا مشورہ دیا۔ مقدمہ ان کے سامنے پیش ہوا۔ طرفین کے دلائل سن کر قاضی شریح نے فیصلہ بیٹے کے خلاف دیا۔ جب گھر واپس آئے تو بیٹے نے کہا اگر میں نے آپ سے پہلے مشورہ نہ کیا ہوتا تو مجھے آپ سے کوئی شکایت نہ ہوتی لیکن مشورہ کے بعد آپ کے حکم سے میں نے مقدمہ دائر کیا مگر فیصلہ پھر بھی آپ نے میرے خلاف دے کر مجھے رسوا کر دیا ہے۔ قاضی شریح نے جواب دیا:

**واللہ یا بنی لَاَنتَ احب الی من ملٔ الارض مثلھم ولکن اللہ ھو اعز علی منک، خشیت ان اخبرک ان القضاء علیک فتصالحھم فتذھب ببعض حقھم. (صفۃ الصفوۃ ج 3 ص 19)**

جان پدر خدا کی قسم تو مجھے ان لوگوں جیسے روئے زمین بھر کے آدمی سے زیادہ عزیز ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ مجھے تجھ سے زیادہ عزیز ہیں (تیرے مشورہ کے بعد) مجھے خوف ہوا کہ اگر میں نے تجھے بتلا دیا کہ فیصلہ تیرے خلاف ہوگا تو تو ان سے صلح کر لیتا اور اس طرح ان کا کچھ حق ضرور ضائع ہو جاتا۔

اس قسم کا ایک اور واقعہ پیش آیا کہ ایک بار قاضی شریح کے ایک لڑکے نے کسی ملزم کی ضمانت دی ملزم بھاگ گیا تو قاضی شریح نے اپنے بیٹے کو گرفتار کروا کر قید میں ڈال دیا۔ (طبقات ابن سعد ج 6 ص 134)

ایک بار قاضی شریح کے ایک ملازم سپاہی نے ایک شخص کو کوڑوں سے پیٹا تو انہوں نے مضروب سے اسے کوڑے لگوائے۔ (طبقات ابن سعد ج 6 ص 138)

ایک بار ان کی برادری کے ایک شخص نے کسی شخص پر کچھ ناروا ظلم کیا۔ قاضی شریح نے اسے سزا کے طور پر ایک ستون سے بندھوا دیا۔ شریح جب واپس جانے لگے تو اس

شخص نے کچھ کہنا چاہا، قاضی شریح نے جواب دیا، مجھ سے بات کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس لیے کہ میں نے تمہیں قید نہیں کیا، بلکہ حق نے قید کیا ہے۔ (طبقات ابن سعد ج 2 ص 135)

## قضا میں احتیاط

جریر ازدی قاضی شریح سے روایت کرتے ہیں کہ میں بھوک اور غصہ کی حالت میں مقدمات کی سماعت نہیں کرتا...... بلکہ عدالت سے اٹھ جاتا ہوں۔ (طبقات ابن سعد ج 6 ص 137)

## ذکاوت وذہانت

امام شعبیؒ سے روایت ہے کہ میں قاضی شریح کی عدالت میں حاضر تھا کہ ایک عورت ایک مرد سے جھگڑتی ہوئی آئی اور عدالت میں زار وقطار رونے لگی۔ میں نے دل میں یہ خیال کر کے کہ یہ بیچاری مظلومہ ہے قاضی شریح سے کہا یہ بے چاری مظلومہ معلوم ہوتی ہے۔ قاضی شریح نے جواب دیا، "اے شعبی برادران یوسف بھی اپنے باپ کے پاس روتے ہوئے ہی آئے تھے۔" (صفۃ الصفوۃ: ج 3 ص 20)

## عبادت وریاضت

قاضی شریح موجودہ دور کے ججوں کے مثل نہ تھے، بلکہ وہ عابد، زاہد، متقی، شب زندہ دار تھے۔ تمام دن باوضو رہتے اور دن بھر کی تمام نمازیں ایک ہی وضو سے ادا کرتے۔ آپ کا معمول تھا کہ فجر کی نماز مسجد میں پڑھ کر گھر آجاتے اور اپنے کمرے کا دروازہ بند کر کے تقریباً نصف النہار تک اوراد و وظائف، ذکر و نوافل، تلاوت وتسبیحات میں مشغول رہتے۔

حضرت علی المرتضیٰ ﷺ کے حکم سے آپ کوفہ کی جامع مسجد میں تراویح کی امامت فرمایا کرتے تھے۔ (طبقات ابن سعد بذیل ترجمہ)

## اخلاق وعادات

قاضی شریح اخلاق و عادات کے اعتبار سے اسلاف یعنی صحابہ کرام ﷺ اجمعین کا مکمل نمونہ تھے۔ عاجزی وانکساری، تواضع و مسکنت، خوش اخلاقی وخوش مزاجی آپ کی طبیعت ثانیہ تھی۔ حضور نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ سلام کی ابتداء کرنے والا کبر وتکبر سے بری ہوتا ہے، اس لیے قاضی شریح سلام میں ہمیشہ سبقت کرتے تھے۔

قاسم کا بیان ہے کہ کوئی شخص سلام میں قاضی شریح پر سبقت نہیں لے جا سکتا تھا۔

عیسیٰ بن حارث کا بیان ہے کہ میں اکثر سلام میں سبقت کرنے کی کوشش کیا کرتا تھا، مگر کامیاب کبھی نہیں ہوسکا۔ میری ان سے اکثر راستہ میں ملاقات ہوتی تھی۔ میں ابھی اس انتظار ہی میں ہوتا تھا کہ اب سلام کروں، اب سلام کروں کہ اتنے میں وہ قریب پہنچ کر السلام علیکم کہہ دیتے۔ (طبقات ابن سعد ج 6 ص 141)

ایک مسلمان کی شان یہ ہے کہ اس سے دوسرے مسلمان کو کسی قسم کی اذیت اور تکلیف نہ پہنچے۔ قاضی شریح کو اس بات کا اتنا خیال تھا کہ اپنے گھر کے تمام پرنالے بھی گھر کے اندر ہی لگائے تھے، تاکہ اس کے پانی سے کسی گزرنے والے کو تکلیف نہ ہو۔ (طبقات ص 143 ج 6)

اس طرح گھر میں مرنے والے کسی جانور کو باہر نہ پھینکتے کہ اس کی عفونت و بدبو سے کسی کو تکلیف نہ ہو، بلکہ اسے گھر ہی میں زمین کھود کر دفن کر دیتے۔ (طبقات ص 143 ج 6)

امام شعبیؒ سے مروی ہے کہ قاضی شریح نے فرمایا مجھے جب کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو میں چار مرتبہ اللہ تعالیٰ کی حمد اور اس کا شکر ادا کرتا ہوں (سیر اعلام النبلاء ج 4 ص 10، تاریخ ابن عساکر ج 6 ص 313)

ان تمام تفصیلات سے قارئین کے سامنے قاضی شریح کی شخصیت مکمل طور پر نکھر کر سامنے آجاتی ہے اور اس سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ کیا قاضی شریح جیسی شخصیت سے ممکن ہے کہ انہوں نے چند روپوں کی خاطر سید الشہداء حضرت امام حسین ؓ کے قتل کا فتویٰ دیا ہو۔ جو شخص مسلمانوں کی ایذاء رسانی سے اس قدر بچتا ہو کہ گھر کے پرنالے بھی گھر کے اندر لگائے، گھر میں مرنے والے جانور کو بھی باہر نہ پھینکے کہ اس سے مسلمانوں کو اذیت ہوگی۔ کیا ایسے شخص کے بارے میں یہ تصور کیا جاسکتا ہے کہ وہ قتل

حسینؓ میں کسی طرح بھی شریک رہا ہو؟

مذکورہ کانفرنس کے منتظمین نے بلاثبوت قاضی شریح پر الزام و بہتان لگایا ہے۔ اِنَّ هٰذَا الْبُهتانٌ عَظِیْمٌ. ہم نے اس کے جواب کے لیے تاریخ وسیرت کی متعدد کتابوں کو کھنگالا لیکن ہمیں اس کا ثبوت کہیں نہیں ملا، البتہ، یہ ضرور ملا کہ قاضی شریح کی عادت تھی کہ وہ اپنے آپ کو ہمیشہ اختلافی امور سے کنارہ کش رکھتے تھے، چنانچہ عبداللہ بن زبیرؓ کی خلافت کے بارے میں ابو وائلؒ ان سے نقل کرتے ہیں:

**قال لی شریح فی الفتنه یعنی فی فتنه الزبیر ما اخبرت ولا استخبرت ولا ظلمت مسلماً ولا معاهداً دیناراً ولا درهماً. (علیة الاولیاء، ج 4 ص 133 تهذیب الکمال فی اسماء الرجال ص 442 ج 12)**

ابو وائل سے روایت ہے کہ مجھے قاضی شریح نے ابن زبیرؓ کے فتنہ کے بارے میں کہا ''میں نے نہ کسی کو کچھ بتلایا اور نہ کسی سے کچھ پوچھا اور نہ کبھی کسی مسلمان اور کسی ذمی پر ایک دینار و درہم کے بقدر ظلم کیا۔

اس کے علاوہ ہمیں یہ بھی ملا کہ قاضی شریح اور حضرت حسینؓ کے قتل کے مرکزی کردار کوفہ کے گورنر عبیداللہ بن زیاد کے مابین سخت بغض وعداوت اور دشمنی پائی جاتی تھی، چنانچہ ایک بار ابن زیاد کا دایاں ہاتھ بیماری کے سبب گل سڑ گیا۔ تمام اطباء نے اسے کٹوانے کا مشورہ دیا۔ ابن زیاد نے قاضی شریح سے مشورہ کیا تو قاضی شریح نے جواب دیا مجھے یہ پسند نہیں کہ تم اپنی بقیہ زندگی کٹے ہوئے ہاتھ کے ساتھ گزارو اور اگر تمہاری موت قریب آ چکی ہے تو کیا اللہ تعالیٰ سے ملاقات کٹے ہوئے ہاتھ سے کرو گے۔ اگر اللہ نے پوچھ لیا کہ یہ ہاتھ کیوں کٹوایا تو کیا یہ جواب دو گے کہ آپ کی ملاقات کو ناپسند کرتے ہوئے۔ اس پر ابن زیاد نے اپنا ہاتھ نہیں کٹوایا اور اس کا زہر تمام جسم میں سرایت کر گیا۔ جس کی بنا پر وہ اسی دن مر گیا۔ **فَلَامَ الناس شریحاً حَیْثُ نَصَحَ لَهٗ لِبُغْضِهِم لزِیَادٍ.** لوگوں نے قاضی شریح کو ملامت کی کہ انہوں نے ابن زیاد کو اپنی عداوت کی وجہ سے غلط مشورہ دیا۔ (شذرات الذہب ص 85 ج 1)

اہل تشیع کے نامور عالم و محقق ملا باقر مجلسی جو بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں انہوں

نے اپنے ائمہ کے حالات پر ایک ضخیم کتاب بنام ''جلاء العیون درزندگانی و مصائب چہاردہ معصوم علیہم السلام'' لکھی ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے حضرت امام حسینؓ کے حالات بڑی تفصیل سے لکھے ہیں جو 200 سے زائد صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں اس میں بھی قاضی شریح کے اس فتویٰ کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ اگر یہ بات حقیقت پر مبنی ہوتی تو ملا باقر مجلسی ضرور اسے نقل کرتے، البتہ انہوں نے صرف اتنا نقل کیا ہے کہ جب حضرت حسین ﷺ نے مسلم بن عقیل کو کوفہ کے حالات معلوم کرنے کے لیے بھیجا تو کوفہ میں مسلم بن عقیل ہانی بن عروہ کے ہاں قیام کیا، ابن زیاد کے جاسوسوں نے اسے مطلع کر دیا کہ مسلم بن عقیل نے ہانی بن عروہ کے ہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ابن زیاد نے ہانی کو اپنے ہاں طلب کیا اور اس سے کہا کہ مسلم بن عقیل کو میرے حوالے کرو۔ ہانی نے انکار کیا۔ اس پر بات بڑھ گئی اور ابن زیاد نے اپنے ہاتھ کی چھڑی سے ہانی کو پیٹا اور زخمی کر دیا۔ اس پر ہانی بن عروہ نے اپنی تلوار نکالنا چاہی کہ ابن زیاد نے اپنے آدمیوں سے اسے گرفتار کروا لیا۔ باہر یہ خبر مشہور ہوگئی کہ ہانی کو قتل کر دیا گیا ہے۔ جس پر عمرو بن حجاج نے قبیلہ مذحج کے لوگوں کو جمع کر کے ابن زیاد کے گھر (دارالامارۃ) کے باہر مظاہرہ شروع کر دیا کہ ہانی کو بلا کسی جرم کے قتل کیا گیا ہے اس کے خون کا بدلہ دیا جائے۔ ابن زیاد جب اس مظاہرہ سے پریشان ہوا تو:

**شریح قاضی را گفت بروهانی را ببیں و مردم را خبرده که او زنده است چوں شریح بنزد هانی رفت دید که خون از روئے هانی جاریست و می گوید که کجا یند خویشاں و یاوران سن اگر ده نفر از ایشاں بقصر درآیند مرا از شر این ملعون نجات می دهند. پس شریح بیرون آمد و صدا زد از بالائے قصر که هانی زنده است و آسیبے باو نرسیده است. چوں اهل قبیله او شنید ند که او زنده است پراگنده شدند.**

(ابن زیاد نے) قاضی شریح سے کہا باہر جاؤ اور ہانی کو دیکھو اور لوگوں کو اطلاع کر دو کہ وہ زندہ ہے جب قاضی شریح ہانی کے پاس گئے دیکھا کہ خون ہانی کے چہرے سے جاری ہے اور ہانی کہہ رہے ہیں کہ کہاں ہیں میرے عزیز دوست۔ اگر ان میں سے دس

آدمی بھی محل میں آ جائیں تو مجھے اس ملعون کے شر سے نجات دے سکتے ہیں۔ قاضی شریح باہر آئے اور محل کے بالا خانہ۔ سے آواز دی کہ ہانی زندہ ہیں اور انہیں کوئی تکلیف نہیں پہنچی ہے۔ جب ان کے قبیلہ نے یہ سنا کہ ہانی زندہ ہیں تو (مظاہرین) وہاں سے منتشر ہو گئے۔ (جلاء العیون ص 363 مطبوعہ ایران)۔